# بابری مسجد، سیکولرزم اور سپریم کورٹ

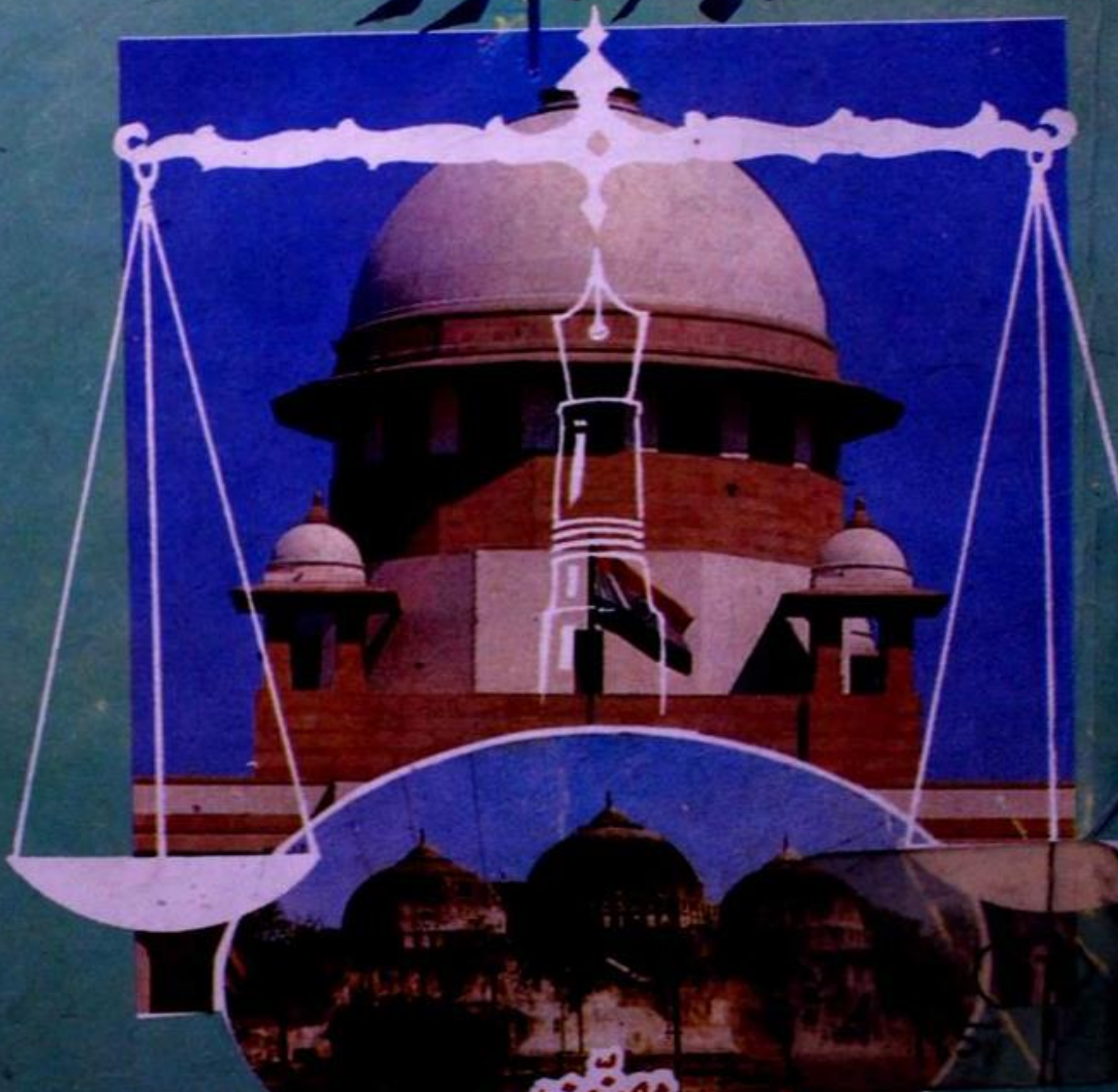

مصنف
مشتاق احمد (علیگ) ایڈوکیٹ
سپریم کورٹ آف انڈیا، تلک مارگ نئی دہلی

# بابری مسجد سیکولرزم
# اور سپریم کورٹ

مصنف
**مشتاق احمد** (علیگ) ایڈوکیٹ
سپریم کورٹ آف انڈیا، تلک مارگ نئی دہلی ۱

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں
(اس کی جزوی طباعت بھی پہلے سے حاصل کردہ اجازت کے بغیر ممنوع ہے)

| | |
|---|---|
| نام کتاب | بابری مسجد، سیکولرزم اور سپریم کورٹ |
| مصنف | مشتاق احمد (علیگ) ایڈوکیٹ سپریم کورٹ |
| کمپوزنگ | افکار کمپوزر، E-22/153، ذاکر نگر، نئی دہلی-۲۵ |
| طابع | پرنٹ لوک، A ۲۰/۵۸۱، ذاکر نگر، نئی دہلی-۲۵ |
| قیمت | |
| تاریخ اشاعت | ۶ر دسمبر ۱۹۹۵ء |
| ناشر | قاضی پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس<br>وشیج بلڈنگ، نظام الدین (ویسٹ)، نئی دہلی ۱۳<br>فون ۴۶۱۷۲۴۰ |

DR. S. FAROOQ
M.Sc., Ph.D., Av.R., P.G.D.B.M.

PHONES: (O) 533035, 5414249
(R) 6845897, 6838987
FAX : 5454332

RESIDENCE :
321-D, OKHLA VILLAGE,
NEW DELHI - 110 025

04/12/1995

Mr. Mushtaq Ahmed

I am happy to learn about the book " Babri Masjid, Secularism and Supreme Court," written by you.

I admire your gesture of trying to bring the right picture before the people. It is a solemn duty of every Indian to protect the Constitution and Secular Values of his beloved Country.

I am sure your efforts will be appreciated by every Secular minded and Peace loving person.

Wish you all the success.

Yours Sincerely

Dr. S. Farooq

# انتساب

ڈال دو سب مسجدوں کے گرد سجدوں کا حصار
اپنے کعبہ کی جبینوں سے نگہبانی کرو

فرحت احساس

میں منسوب کرتا ہوں
ان مسلمانوں کے نام جن کو بابری مسجد کی
شہادت
پر شہادت کا شرف نصیب ہوا

مشتاق احمد (علیگ)
ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا

"نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اتنے بڑے اور حساس مسئلہ پر ایک آئینی طور پر منتخب شدہ حکومت اپنے فرائض منصبی کو پورا کرنے سے قاصر رہی۔ عدلیہ، آئین، پارلیمینٹ اور عوام سے جو وعدے کئے گئے تھے، ان کی پاسداری نہ کی گئی۔ یہ ایک ناکامی بھی ہے اور وشواس گھات بھی۔"

سپریم کورٹ آف انڈیا

"جو کچھ بھی مسمار کیا گیا وہ صرف ایک پرانی تعمیر ہی نہیں تھی بلکہ اکثیریت کے احساس عدل اور معقول پسندی پر اقلیت کے بھروسہ اور اعتماد کو ایک کاریٔ ضرب تھی جس نے آئینی عمل اور قانون کی بالادستی میں اقلیت کے یقین کو متزلزل کر دیا۔ ایک بے یار و مدد گار پانچ سو سالہ قدیم عمارت، جس کی حفاظت صوبائی حکومت کے ہاتھوں میں ایک مقدس امانت تھی، توڑدی گئی۔"

سپریم کورٹ آف انڈیا

# ابتدائیہ

۲۴ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو سپریم کورٹ نے اسپیشل ریفرینس نمبر ایک بابت ۱۹۹۳ء اور ایودھیا حصول اراضی ایکٹ ۱۹۹۳ء پر اپنا فیصلہ سنایا۔ اخبارات میں اس فیصلے کے متعلق خبریں چھپیں، تبصرے ہوئے لیکن اردو اخبارات میں جتنی خبریں چھپیں اور جتنے تبصرے آئے، ان کو پڑھنے سے ایسا لگا جیسے یہ تبصرے فیصلے کو پڑھے بغیر لکھے گئے ہیں۔ یوں بھی اتنے بڑے فیصلے کو پڑھنے کے لئے وقت چاہیئے جب کہ اخبار والوں کو نیوز (News) دینی ہوتی ہے۔ اور نیوز کی اہمیت اس وقت ہوتی ہے جب وہ تازہ ہو۔ ان تبصروں کو پڑھ کر عام آدمی کے لئے اس فیصلے کے مضمرات کو سمجھنا اور ان کے حسن و قبح کے بارے میں کوئی واضح نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں تھا۔ عام قاری کنفیوژن (Confusion) کا شکار تھا۔

نومبر ۱۹۹۴ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی ایک میٹنگ دار القضا، اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی میں ہوئی۔ اس میٹنگ کا مقصد یہ تھا کہ بورڈ کے ممبران کو سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بارے میں مکمل جانکاری حاصل ہو جائے۔ جیسے جیسے میں فیصلے کے اہم نکات کو بیان کرتا گیا، ممبران منہمک ہو کر سننے لگے اور آخر میں سب نے قدرے اطمینان کا

سانس لیا۔ عام طور سے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک پریس ریلیز بھی جاری کیا گیا۔ ممبران نے یہ طے کیا کہ چونکہ فیصلہ اچھا اور عادلانہ ہے، اس لئے اس کی تلخیص مختلف زبانوں میں شائع کی جائے۔ فیصلے کی تلخیص (Synopis) تیار کرنے کی ذمہ داری راقم کو دی گئی۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کو اس فیصلے پر ایک سیمنار کیا جائے جس میں یہ کتاب تقسیم کی جائے۔ وقت بہت کم تھا۔ وکالت کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود راقم نے اس فیصلے کی تلخیص تیار کی جسے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے "سپریم کورٹ کا فیصلہ۔ ایک جائزہ" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کتاب میں صرف سپریم کورٹ کے فیصلے کا خلاصہ ہے۔ جلدی میں چھپنے کی وجہ سے کتابت کی غلطیاں رہ گئیں۔ اور دیکھتے دیکھتے ساری کاپیاں بھی ختم ہو گئیں۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے کی اہمیت اور اس کے پورے مضمرات کو سمجھنے کے لئے بابری مسجد سے متعلق تمام مقدمات کے پس منظر کو سمجھنا از حد ضروری ہے۔ چونکہ اب معاملہ پھر لکھنؤ کی عدالت میں چلا گیا ہے، جہاں ملکیت کے مقدمات (Title Suits) کی سماعت شروع ہو چکی ہے، اس لئے ان مقدمات کا قانونی اور واقعاتی پس منظر مختصر مگر جامع انداز میں اس کتاب میں دیا گیا ہے۔

۲۴ اکتوبر ۹۴ء کو ہی سپریم کورٹ نے مسٹر کلیان سنگھ کو توہین عدالت کا مجرم قرار دیتے ہوئے ایک دن کی قید اور دو ہزار روپے کا جرمانہ عائد کیا۔ مسٹر کلیان سنگھ کے سنگینی، جرم کو دیکھتے ہوئے یہ سزا بہت مضحکہ خیز لگتی ہے لیکن اس فیصلے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے توہین عدالت کے سلسلہ میں بہت ہی سخت اور سنہرے قانونی اصول مرتب کر دئے ہیں جس کی رو سے وزیر اعلیٰ، وزیر اعظم، یا کسی بھی سیاسی لیڈر کو عدالت کی حکم عدولی کے لئے سزادی جا سکتی ہے چاہے سزا فیصلہ سناتے وقت وہ اپنے عہدے پر ہو یا نہ ہو۔ سپریم کورٹ نے یہ اصول مرتب کر دیا ہے کہ اگر کوئی وزیر اعلیٰ عدالت کو اس کے حکم کی پاسداری کے لئے یقین دہانی (Undertaking) دیتا ہے تو یہ یقین دہانی وزیر اعلیٰ کی حیثیت میں اور ذاتی حیثیت، دونوں میں مانی جائیگی۔ اس کتاب میں اس فیصلہ کا ذکر باب تین میں کیا گیا ہے۔

مسٹر کلیان سنگھ کو جو سزادی گئی ہے وہ بابری مسجد کے قریب پختہ پلیٹ فارم کی تعمیر کے سلسلے میں تھا۔ چھ دسمبر کے واقعات کے سلسلہ میں توہین عدالت کے مقدمات سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہیں۔ توہین عدالت کے یہ مقدمات محمد اسلم عرف بھورے، نوید یار خان اور اچھن رضوی نے دائر کئے ہیں۔ اس کے علاوہ سپریم کورٹ نے خود سے

(Suo motu) بھی توہین عدالت کے نوٹس جاری کئے ہیں۔ بی جے پی، وی ایچ پی، بجرنگ دل اور آٹھ سرکاری افسروں کے خلاف مقدمات زیر سماعت ہیں۔ سب پر نوٹس کی تعمیل ہو چکی ہے۔ کچھ کو چھوڑ کر جوابی حلف نامے بھی داخل ہو چکے ہیں۔ محمد اسلم نے مرکزی حکومت کے کئی وزیروں کے خلاف بھی توہین عدالت کے مقدمات دائر کئے ہیں جن میں وزیر اعظم پی وی نرسمہاراؤ کا بھی نام ہے۔ اچھن رضوی اور نوید یار خان اپنے مقدمات کی پیروی چھوڑ چکے ہیں۔ ان مقدمات کی پیروی بھی محمد اسلم کر رہے ہیں۔ جس میں راقم اور جناب ایم ایم کشیپ، ایڈوکیٹ آن رکارڈ کام کر رہے ہیں۔ ان مقدمات کی تفصیل باب چار میں دی گئی ہے۔ جناب کشیپ ایک بہت ہی سیکولر اور انصاف پسند وکیل ہیں جو شروع سے ہی سپریم کورٹ میں بابری مسجد مقدمات کی پیروی بہت ہی لگن، محنت اور تندہی سے کرتے رہے ہیں۔

یہ کتاب ڈاکٹر ایم منظور عالم صاحب، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز (Institute of Objective Studies) نئی دہلی، مولانا اسرار الحق قاسمی صاحب، اسسٹینٹ سکریٹری جنرل، آل انڈیا ملی کونسل، نئی دہلی اور جسٹس ایم۔ ایم قاضی۔ چیرمین مہاراشٹر اسٹیٹ سروسز ٹریبونل، بمبئی کی حوصلہ افزائیوں کا ثمرہ ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے ان

حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں شکر گذار ہوں جناب سید امین الحسن رضوی صاحب کنوینر لیگل سیل، آل انڈیا ملی کونسل، کا جنہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اس کتاب کے مسودہ کو پڑھا اور اپنے نیک مشوروں سے نوازا میں بطور خاص قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب، امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ اور جنرل سیکریٹری آل انڈیا ملی کونسل کا بے پناہ ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے اکثر راقم کی ہمت افزائی فرمائی۔

مشتاق احمد (علیگ)
ایڈوکیٹ، سپریم کورٹ آف انڈیا
بار لائبریری، تلک مارگ، نئی دہلی
مورخہ ۲، دسمبر ۱۹۹۵ء

# باب اول

## بابری مسجد مقدمہ

### صدارتی رائے طلبی اور ایودھیا حصول آراضی ایکٹ، ۱۹۹۳ء پر سپریم کورٹ آف انڈیا کا فیصلہ

۲۴ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو سپریم کورٹ کے پانچ ججوں پر مشتمل آئینی بنچ (Constitution Bench) نے آئین ہند کے آرٹیکل ۱۴۳(۱) کے تحت کئے گئے ریفرینس اور ایودھیا حصول آراضی ایکٹ، ۱۹۹۳ء کی واجبیت اور آئینیت پر اپنا فیصلہ صادر کیا جو قانونی لحاظ سے نہایت اہم اور زیر سماعت مقدمات کے تعلق سے بہت دوررس نتائج کا حامل ہے۔ یہ فیصلہ پانچوں ججوں کا متفقہ فیصلہ نہیں ہے بلکہ تین فاضل ججوں کے فیصلے کے مقابلہ میں دو ججوں نے کچھ نکات پر اختلاف کرتے ہوئے اپنا علیحدہ فیصلہ لکھا ہے اکثریتی فیصلہ جسٹس جے۔ ایس ورما نے اپنی طرف سے اور اس وقت کے چیف جسٹس ایم۔ این وینکٹا چلیہ اور جسٹس جی این رے کی طرف سے

لکھا اور اقلیتی فیصلہ جسٹس ایس پی بھروچہ نے اپنی طرف سے اور جسٹس اے۔ ایم احمدی کی طرف سے لکھا۔

## پس منظر

سپریم کورٹ کے فیصلے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ بابری مسجد پر قانونی لڑائی کی تاریخ کا ایک مختصر مگر جامع پس منظر پیش کیا جائے اس پس منظر کی کسوٹی پر ہی سپریم کورٹ کے فیصلے کو پرکھا جاسکتا ہے۔

سب سے پہلی قانونی لڑائی ۱۹ جنوری ۱۸۸۵ء میں شروع ہوئی جب مہنت رگھوبیر داس نے مہنت جنم استھان کی حیثیت سے مقدمہ نمبر ۲۸۰ بابت ۱۸۸۵، سکریٹری، اسٹیٹ آف انڈیا کے خلاف دائر کیا، جس میں انہوں نے عدالت سے مسجد کے سامنے چبوترہ پر ایک مندر بنانے کی اجازت چاہی۔ عرضی دعویٰ کے ساتھ جو نقشہ نظری انہوں نے داخل کیا، اس میں مسجد کو چبوترہ کے پچھم طرف دکھایا۔ اور اس طرح بابری مسجد کے وجود کو تسلیم کیا۔ یہ مقدمہ شری کرش سب جج فیض آباد کی عدالت میں دائر کیا گیا تھا۔

مسجد کے اس وقت کے متولی جناب اصغر اس میں فریق بنے

اور مقدمہ لڑا۔ اصغر صاحب کا یہ کہنا تھا کہ مدعی نے جو داد رسی عدالت سے کی ہے اور اگر عدالت اسے منظور کرتی ہے تو اس سے بابری مسجد متاثر ہوگی۔ یہ مقدمہ ۲۴ دسمبر ۱۸۸۵ء کو خارج ہو گیا۔ اس فیصلے کے خلاف پہلی اپیل ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کی عدالت میں دائر کی گئی جو خارج ہو گئی۔ پھر دوسری اپیل جو ڈیشیل کمشنر اودھ کے یہاں لڑی گئی اور وہ بھی خارج ہو گئی۔

مقدمات کا دوسرا دور ۱۹۴۹ء میں شروع ہوا جب ۲۲ اور ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب کو زبردستی چوری چھپے اور غیر قانونی طور پر رام چبوترے کی مورتیوں کو مسجد کے اندر وسطی گنبد کے ٹھیک نیچے رکھ دیا گیا اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ وہ کرشماتی طور پر از خود رام چبوترے سے ہٹ کر وہاں برآمد ہوئیں ہیں۔ پولس کانسٹبل ماتا دین کی رپورٹ پر سب انسپکٹر پنڈت رام دیو دوبے نے اس بابت پرچہ اطلاع واردات (ایف آئی آر) درج کیا کہ زبردستی اور غیر قانونی طور سے مورتیاں مسجد کے اندر رکھ دی گئیں اور مسجد ناپاک کردی گئی ہے۔ اس کے بعد متعلقہ مجسٹریٹ نے جائیداد کو دفعہ ۱۴۵ ضابطہ فوجداری کے تحت ۲۹، دسمبر ۱۹۴۹ء کو عدالت کی تحویل میں لے لیا اور مسٹر پریہ دت رام کو ریسیور (Reciever) مقرر کر دیا جو اس وقت ایودھیا اور فیض آباد میونسپلٹی کے چیرمین تھے۔ ریسیور کی قانونی

حیثیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مقدمہ کے فیصلہ ہونے تک تکراری جائیداد کو عدالت کے لئے اپنی تحویل میں رکھتا ہے۔

۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو گوپال سنگھ وشارد نے مقدمہ نمبر ۲ بابت ۱۹۵۰ء بعدالت سول جج فیض آباد دائر کیا جس میں پانچ مسلمانوں کو فریق بنایا گیا ظہور احمد، حاجی فیکور، محمد فائق، محمد سمیع اور، محمد اچھن میاں۔ بعد میں بتاریخ ۵ جنوری ۱۹۵۰ء کو مزید چار لوگوں کو فریق بنا گیا۔ حکومت اتر پردیش، ڈپٹی کمشنر فیض آباد، سٹی مجسٹریٹ فیض آباد اور، ایس پی فیض آباد اس مقدمہ میں مدعی نے عدالت سے مندرجہ ذیل داد رسی کی استدعا کی:۔

(۱) اس امر کا استقرار کہ مدعی کو بھگوان رام چندر وغیرہ براجمان استھان جنم بھومی کے مورتیوں کو بغیر کسی روک ٹوک کے پوجا اور درشن کرنے کا حق ہے، جس کی تفصیل عرضی دعویٰ میں دی گئی ہے اور یہ کہ مدعا علیہم کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔

(۲) اس بابت ایک دوامی حکم امتناعی کہ مدعا علیہم کو وہاں سے مورتیاں ہٹانے، پوجا اور درشن میں رخنہ ڈالنے یا وہاں آنے جانے میں کسی طرح کی رکاوٹ ڈالنے سے باز رکھا جائے

ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے اس مقدمہ میں اپنی جانب سے اور حکومت اتر پردیش کی جانب سے بیان تحریری Written

Statement) داخل کیا جس کے پیراگراف ۱۱اور ۱۲، ۱۳اور ۱۴ میں لکھا ہے

"پیرگراف ۱۱: مدعی کو اس مقدمہ کے لئے کوئی حق نالش (Cause of Action) نہیں ہے

پیراگراف ۱۲: جائیداد مقدمہ (Suit Property) بابری مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اور بہت ہی لمبے عرصے سے مسلمان اپنی عبادت کے لئے اسے مسجد کے طور پر استعمال کرتے آئے ہیں یہ کبھی بھی شری رام چندر جی کے مندر کے طور پر استعمال نہیں ہوئی۔

پیراگراف ۱۳: ۲۲اور ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب میں شری رام چندر جی کی مورتیاں چوری چھپے اور غیر قانونی طریقے سے اس کے اندر رکھ دی گئیں۔

پیراگراف ۱۴: اس غیر قانونی حرکت کے نتیجے میں امن عامہ کو خطرہ لاحق ہو گیا اور عوامی حکام کو نقض امن کے خطرہ کو رفع کرنے کے لئے مداخلت کرنا پڑی"

نوٹ:۔ چونکہ اس مقدمہ کے سارے مسلمان فریق فوت ہو چکے تھے، اس لئے یو۔پی سنی سنٹرل وقف بورڈ کی درخواست پر مقدمہ کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور سنی سنٹرل وقف بورڈ کو فوت شدہ مسلمانوں کی جگہ پر قائم

مقام (Substitute) کر کے ، جنوری ۱۹۸۷ء کو فریق بنایا گیا اور اصل مدعی گوپال سنگھ وشارد کی جگہ شری راجندر سنگھ فریق بنے۔

نوٹ: اس مقدمہ کے عرضی دعویٰ (Plaint) میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا تھا کہ بابری مسجد کی جگہ پر کوئی مندر تھا جسے توڑ کر یہ مسجد بنائی گئی یا یہ کہ بابری مسجد پہلے مندر تھا۔

۵ جنوری ۱۹۵۰ء کو کچھ دنوں کے بعد پرہنس رام چندر داس نے ایک دوسرا مقدمہ نمبر ۲۵ بابت ۱۹۵۰ء دائر کیا جس میں پہلے مقدمہ کے پانچ مسلمان حکومت اتر پردیش اور ڈپٹی کمشنر فیض آباد کو فریق بنایا۔

اس مقدمہ میں مدعی نے مندرجہ ذیل دادرسی مانگی:۔

(الف) عدالت اس بات کی توثیق کرے کہ مدعی کو بھگوان رام چندر جی وغیرہ کی مورتیوں، براجمان استھان جنم بھومی کے پاس بنا کر ہندو مذہب کی روایت کے مطابق پوجا اور درشن کا حق ہے۔ اور مدعا علیہم نمبران ۱ تا ۵، ۶ اور ۷ یا ان کے وارثان کو اس میں رکاوٹ ڈالنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(ب) بذریعہ حکم امتناعی دوامی مدعا علیہم ۱ تا ۵ اور ۶ اور ۷ کو مورتیوں کو وہاں سے ہٹانے، دروازہ بند کرنے یا آنے جانے کا راستہ روکنے سے باز رکھا جائے یا انہیں کسی بھی طرح پوجا، پاٹھ اور درشن میں مداخلت

سے روکا جائے۔

نوٹ: اس مقدمہ میں بھی عرضی دعویٰ میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ بابری مسجد کی جگہ پہلے مندر تھا جسے توڑ کر یہ مسجد بنائی گئی یا یہ کہ بابری مسجد پہلے ایک مندر تھا۔

اس مقدمہ میں جنوری ۱۹۵۱ء میں مدعا علیہم ۶ اور ۷ یعنی حکومت اتر پردیش اور ڈپٹی کمشنر فیض آباد کی طرف سے جواب دعویٰ (Written Statement) داخل کیا گیا جس کے پیراگراف ۱۴، ۱۵ اور ۱۶ میں یہ کہا گیا:

"پیراگراف ۱۴:۔ نزاعی جائداد بابری مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے اور عرصہ دراز سے مسلمان اسے جائے عبادت کے طور پر استعمال کرتے آئے ہیں۔ شری رام مندر کے طور پر یہ کبھی استعمال نہیں ہوئی۔

پیراگراف ۱۵:۔ ۲۲ اور ۲۳، دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں مورتیاں اس کے اندر چوری چھپے اور غیر قانونی طور سے رکھ دی گئیں

پیراگراف ۱۶:۔ اس غلط اقدام کے نتیجے میں امن عامہ کو خطرہ لاحق ہو گیا اور حکام کو نقض امن کے خطرے کو روکنے کے لئے مداخلت کرنا پڑی۔

یکم فروری ۱۹۵۱ء کو مقدمہ نمبر ۲ بابت ۱۹۵۰ء اور مقدمہ نمبر ۲۵ بابت ۱۹۵۰ء کو بحکم سول جج، فیض آباد شنوائی کے لئے یکجا (Consolidate) کر دیا گیا۔

۴، اگست ۱۹۵۱ء کو مدعا علیہم ۱ تا ۵ (ظہور احمد وغیرہ) کی طرف سے ایک درخواست ضابطہ دیوانی کے آرڈر ایک رول ۸ سی پی سی کے تحت مقدمات کو نمائندہ حیثیت (Representative Capacity) میں تبدیل کرنے کے لئے داخل کی گئی۔ دونوں مقدمات کے مدعیان (گوپال سنگھ وشارد اور پرم ہنس رام چندر داس) نے اس درخواست کی پر زور مخالفت کی۔ مقدمہ نمبر ۲ بابت ۱۹۵۰ء کے مدعی نے اپنے تردید نامے میں لکھا:

"۸: مدعی نے یہ مقدمہ ذاتی حیثیت میں ذاتی حق کے لئے کیا ہے۔ ہندو مذہب کے لوگ پوری دنیا میں پھیلے ہیں، اور ان کے خیالات، طور طریقے اور پوجا کرنے کے طریقے الگ الگ ہیں۔ ان حالات میں مدعی سارے ہندوؤں کی نمائندگی نہ کر رہا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔"

مدعیان کے پرزور مخالفت کی وجہ سے یہ درخواست سول جج نے ۲۷، اکتوبر ۱۹۵۱ء کو خارج کر دی۔

نرموہی اکھاڑہ نے ۱۷، اکتوبر ۱۹۵۹ء کو ایک تیسرا مقدمہ نمبر ۲۶ بابت ۱۹۵۹ء داخل کیا جس میں پہلے مقدمات کے سارے فریقوں کے علاوہ مسٹر پریہ دت رام ریسیور (Receiver) کو بھی پارٹی بنایا گیا۔

اس مقدمہ میں مدعی نے مندرجہ ذیل داد رسی مانگی:

"(الف) مدعیان کے حق میں ایک ڈگری صادر فرمایا جائے جس کی

رو سے مدعا علیہ نمبر ۳ کو جنم بھومی مندر کے انتظام و انصرام سے ہٹایا جائے اور مدعا علیہ نمبر ۲ کو حکم دیا جائے کہ مندر کا انتظام مدعیان کے حوالے کردے۔"

نوٹ:۔ اس مقدمہ کے عرضی دعویٰ میں بھی اس بات کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ بابری مسجد کے پہلے وہاں کوئی مندر تھا جسے توڑ کر مسجد بنائی گئی یا یہ کہ یہ مسجد پہلے مندر تھی۔

نوٹ (۲): چونکہ اس مقدمہ کے سارے مسلمان فریق فوت ہو چکے تھے اس لئے ان کی جگہ پر یوپی سنی سنٹرل وقف بورڈ فریق مقدمہ بنا ہے۔

ان مقدمات کے مدعا علیہم نے مقدمہ لڑنا شروع کیا۔ ان کی طرف سے جواب دعویٰ داخل کیا گیا۔ حکومت اتر پردیش ڈپٹی کمشنر اور کلکٹر کی طرف سے داخل کئے گئے جواب دعویٰ میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے کہ نزاعی جائیداد کبھی بھی مندر نہیں تھی بلکہ یہ ایک مسجد ہے جس میں مسلمان بغیر کسی روک ٹوک کے نماز ادا کرتے آئے ہیں۔ ۲۲ اور ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب میں اس کے اندر مورتیاں چوری چھپے اور غیر قانونی طریقے سے رکھ دی گئیں۔

دس سال سے زیادہ کا وقفہ گذر گیا لیکن ان مقدمات کی سماعت میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی۔ اس لئے سنی سینٹرل وقف

بورڈاور محمد ہاشم، حاجی شمس الدین، مولوی نصیراور محمد احمد نے مقدمہ نمبر ۱۲ بابت ۱۹۶۱ء دائر کیا جس میں پہلے کے مقدمات کے مدعیان کو فریق بنایا گیا ۔ اس مقدمہ کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ مقدمہ Representative Capacity میں دائر کیا گیا ۔ یعنی سارے مسلمانوں کی طرف سے سارے ہندوؤں کے خلاف ۔ جب کہ پہلے کے مقدمات شخصی حقوق کے تحفظ کے لئے شخصی حیثیت میں دائر کئے گئے تھے ۔ اس مقدمہ نمبر ۱۲ بابت ۱۹۶۱ء کے نمائندہ حیثیت ( ) Representative Capacity کو عدالت نے تسلیم بھی کرلیا۔

اس مقدمہ میں مدعیان نے حسب ذیل دادرسی (Relief) مانگی:

" ( الف ) : عدالت اس امر کا استقرار (Decl aration) کرے کہ نقشہ نظری میں جو جائیداد ABCD دکھائی گئی ہے وہ عوامی مسجد ہے جسے بابری مسجد کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس کے آس پاس کی جائیداد جسے EFGH سے دکھایا گیا ہے وہ مسلم عوامی قبرستان ہے۔"

"(ب) :۔ اگر عدالت کی رائے میں دخل دہانی صحیح حل ہو تو ایک بذریعہ ڈگری عدالت مسجد اور قبرستان کا دخل فیصلہ مدعیان کو دلوایا جائے اور مسجد کے اندر سے مورتیاں اور دوسرے پوجا وغیرہ کے سامان کو ہٹوایا جائے۔"

اس مقدمہ میں ایک مدعا علیہ نمبر ۱۳ شری ابھے رام کی طرف سے بیان تحریری ۲۰ جولائی ۱۹۶۸ء کو داخل کیا گیا۔ اس میں یا کسی دوسرے مدعا علیہ کے بیان تحریری میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ بابری مسجد کی جگہ پر پہلے کوئی مندر موجود تھا جسے توڑ کر مسجد بنائی گئی یا یہ کہ یہ مسجد پہلے مندر تھا۔

شری ابھے رام داس کے مرنے کے بعد ان کی جگہ ان کے چیلے دھرم داس فریق ثانی بنے۔ انہوں نے اپنے جواب دعویٰ مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۸۹ء کو ۳۰ سال کے بعد پہلی بار بابری مسجد سے پہلے مندر ہونے کا دعویٰ کیا۔

"میر باقی نے جو کہ بابر کا ایک شیعہ کمانڈر تھا بکر مادیہ کے وقت کے شری رام جھومی پر بنے پرانے مندر کو توڑ دیا اور اس کی جگہ اس کے ملبے سے مسجد سے ملتی جلتی ایک عمارت بنانے کی کوشش کی۔ بابر بادشاہ نہیں بلکہ قاتل تھا۔"

بعد میں ان سارے مقدمات کو جمع کر کے مقدمہ نمبر ۱۲ بابت ۱۹۶۱ء کو اصل مقدمہ (Leading case) قرار دیا گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلے مقدمہ نمبر ۲ بابت ۱۹۵۰ء میں درخواست حکم امتناعی پر حکم صادر فرماتے ہوئے سول جج نے لکھا کہ چونکہ مورتیاں جائداد زیر نزاع میں پہلے سے موجود ہیں اس لئے جیسی صورت حال مقدمہ دائر کرنے کے دن تھی، اسی کو برقرار رکھتے ہوئے پجاری کو محدود پوجا کرنے کی اجازت دی

جاتی ہے۔

لیکن مسجد کے دو صدر دروازوں میں تالے لگے رہے جن کی چابیاں رسیور (Receiver) کے پاس تھیں جسے منجانب عدالت مقرر کیا گیا تھا۔ مسجد کے باہر پولس تعنیات کر دی گئی تھی۔ نزاعی جائداد کی بھی حیثیت کو محفوظ رکھنے اور مسجد کے تقدس کا لحاظ رکھتے ہوئے عدالت نے بہت سختی سے کسی بھی باہر کے آدمی کو مسجد کے اندر جانے پر پابندی لگادی تھی۔ مسجد کے دو مین گیٹ بھی نہیں کھلے۔ پجاری کو صرف صبح میں پوجا اور بھوگ کے لئے چھوٹے گیٹ سے اندر جانے کی اجازت تھی۔ چونکہ عدالت کے احکام کی پابندی بہت سختی سے ہوتی رہی اس لئے ایودھیا میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

مقدمہ کی سماعت ملتوی ہوتی رہی جیسا کہ عام طور سے دیوانی مقدمات میں ہوتا ہے اور یہ مقدمہ چونکہ فرقہ وارانہ نوعیت کا تھا اس لئے ممکن ہے اس وجہ سے بھی عدالت مقدمہ کی کارروائی کو آگے بڑھانے میں تامل کرتی رہی ہو اور یہ چاہتی رہی ہو کہ فریقین کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ رسیور پنڈت پریہ دت کا انتقال ہو گیا تو عدالت نے ان کی جگہ پر مسٹر کے۔ کے رام ورما کو رسیور مقرر کیا تو اسے عدالت میں چیلینج کیا گیا۔ پھر عدالت نے ایک دوسرا رسیور مقرر کیا۔ لیکن اس کو بھی ہائی

کورٹ میں چیلیبج کیا گیا۔ ہائی کورٹ نے سول جج فیض آباد کو حکم دیا کہ وہ رسیور کے تقرر پر دوبارہ غور کرے۔ سول جج نے اس پر عمل کرتے ہوئے دوسرا رسیور مقرر کر دیا۔ لیکن اسے بھی ہائی کورٹ میں چیلیبج کیا گیا۔ سول جج کی عدالت سے مقدمہ کی اصل فائل ہائی کورٹ کی لکھنؤ بینچ میں طلب کر لی گئی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کسی بھی رسیور کی تقرری کو مسلمانوں نے کبھی چیلینج نہیں کیا۔ یہ جھگڑا ہندوؤں کے درمیان تھا۔ اس طرح مسلمانوں کو اس مسجد میں نماز پڑھنے کے حق سے محروم کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔

## مسجد کے تالے کیسے کھلے

ہندو بھائیوں کی طرف سے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ مسجد کا تالا عدالت کے حکم سے کھلا۔ آئیے اب دیکھتے ہیں کہ کتنے غیر قانونی، گھناؤنے اور پر فریب طریقے سے تالا کھولا گیا۔ اوپر کے بیان کئے ہوئے پس منظر سے صاف ظاہر ہے کہ سول جج کی عدالت میں جتنے مقدمات تھے ان کو یکجا کر کے مقدمہ نمبر ۱۲ بابت ۱۹۶۱ء کو اصل مقدمہ قرار دیا گیا تھا جس کی پوری اصل فائل رسیور کے تنازعے کے تصفیہ کے لئے لکھنؤ ہائی کورٹ میں بہت

دنوں سے پڑی تھی۔

۲۵ جنوری، ۱۹۸۶ء کو امیش چند پانڈے نامی ایک مقامی وکیل نے ایک درخواست مقدمہ نمبر ۲ بابت ۱۹۵۰ء میں مسجد کے دونوں صدر دروازوں کے تالے کھولنے کے لئے عدالت منصف فیض آباد میں داخل کی اس وقت تک یہ مقدمہ منصف کے دائرہ اختیار سماعت میں آچکا تھا۔

اس درخواست کا کوئی سمن یا نوٹس مسلمان فریقین کو نہیں دیا گیا جبکہ قانون یہ ہے کہ کوئی بھی عبوری درخواست جو عدالت میں داخل کی جائے اس کی نقل مقدمہ کے دوسرے فریق کو دینا قانوناً لازم ہے اور عدالت مقدمہ کے تمام فریقین کو سمن یا نوٹس جاری کرتی ہے۔ درخواست ہذا میں حکومت اتر پردیش، ڈپٹی کمشنر فیض آباد، سٹی مجسٹریٹ اور ایس۔پی فیض آباد کو فریق بنایا گیا اور اس درخواست کی نقل صرف سرکاری وکیل کو دی گئی اور دوسرے مسلمان فریقین مقدمہ کو اس سے بالکل بے خبر رکھا گیا۔ سرکاری وکیل نے ایک جواب داخل کیا جس پر فاضل منصف نے ۲۸، جنوری ۱۹۸۶ء کو یہ حکم صادر فرمایا کہ چونکہ مقدمات کے اصل ریکارڈ ہائی کورٹ میں ہیں، اس لئے درخواست پر کوئی حکم صادر نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر فاضل منصف نے اس درخواست کی سماعت کے لئے آگے کی ایک تاریخ مقرر کر دی۔ یہ حکم بالکل بجا اور برحق

تھا کیونکہ قانون کے مطابق جب تک مقدمہ کی اصل فائل عدالت کے سامنے نہ موجود ہو، اس میں کوئی حکم دیا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ جو بھی حکم ہوتا ہے وہ اصل فائل کے آرڈر شیٹ پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پوری فائل کا مطالعہ کئے بغیر درخواست پر کوئی حکم صادر کرنا صریحاً غیر قانونی اور ضابطہ دیوانی کے یکسر خلاف ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مقدمہ نمبر ۲ بابت ۱۹۵۰ء مسٹر گوپال سنگھ وشارد نے ذاتی حیثیت میں دائر کیا تھا۔ مسٹر امیش چندر پانڈے نہ ہی اس مقدمہ میں فریق تھے، نہ ہی وشارد کا وارث یا نمائندہ اور نہ ہی مسٹر وشارد نے یہ مقدمہ Representative capacity میں داخل کیا تھا تا کہ کوئی بھی آدمی اس میں فریق بن کر عدالت سے رجوع ہو سکے۔ مدعی نے دادرسی میں صرف اپنی پوجا کے حق کی بات کہی تھی۔ نہ کہ پوری ہندوؤں کے لئے یا کسی اور کے لئے۔

جب مسٹر امیش چند پانڈے نے یہ درخواست ۲۵ جنوری ۱۹۸۶ء کو داخل کیا تو اصل مقدمہ کے مدعی مسٹر وشارد کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی جگہ پر ان کے وارثان یا کسی اور کو ان کا قائم مقام نہیں بنایا گیا تھا اسی طرح سے مقدمہ کے دوسرے فریق یعنی ۵ مسلمان بھی فوت ہو چکے تھے اور ان کی جگہ پر ان کے وارثان یا کسی دوسرے کو رکارڈ پر نہیں لایا گیا

تھا۔ اس طرح مقدمہ نمبر ۲ بابت ۱۹۸۶ء جس میں مسٹر امیش چند پانڈے نے مسجد کے تالے کھولنے کی استدعا کی تھی، قانون کی نظر میں سوخت (Abate) ہو چکا تھا یعنی اس مقدمے کی قانونی موت ہو چکی تھی۔ پھر اس میں کسی طرح کا آرڈر پاس ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس مقدمہ میں اس نہج پر اگر مرحوم مسٹر وشار دیا دوسرے فوت شدہ مسلمانوں کے وارثان بھی کوئی درخواست داخل کرتے تو وہ بھی باطل اور قابل نامنظوری ہوتی۔ یہاں تو مسٹر امیش چند پانڈے اس مقدمے کے لئے بالکل اجنبی اور غیر متعلق تھے۔

منصف کے حکم کے خلاف مسٹر امیش چند پانڈے نے ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کی عدالت میں متفرق اپیل نمبر ۸ بابت ۱۹۸۶ء داخل کی۔ اس اپیل میں (۱) حکومت اتر پردیش (۲) ڈپٹی کمشنر فیض آباد (۳) سٹی مجسٹریٹ فیض آباد اور (۴) ایس پی کو فریق (Respondent) بنایا گیا۔ اس مقدمہ میں اصل مقدمہ کے مسلمان مدعا علیہم کو فریق کے طور پر نہیں دکھایا گیا اور نہ ہی ان کے خاندان کے کسی فرد کو یا وارث کو نوٹس دیا گیا اور نہ ہی فیض آباد کے کسی مسلمان کو عدالتی یا اخباری نوٹس دیا گیا۔

پہلی فروری ۱۹۸۶ء کو شہر میں ایک افواہ کے ذریعہ مقدمہ نمبر ۱۲ بابت ۱۹۶۱ء کے مدعی مسٹر ہاشم کو معلوم ہوا کہ ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں

بابری مسجد کے تالے کھولنے کی بابت کوئی حکم صادر ہونے والا ہے۔ مسٹر ہاشم فوراً ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں گئے۔ جہاں انہوں نے دیکھا کہ ڈپٹی کمشنر فیض آباد کا بیان قلمبند ہو رہا تھا۔ انہوں نے فوراً ایک وکیل مقرر کیا اور تب انہیں پوری صورت حال کا علم ہوا اور پتہ چلا کہ عدالت منصف فیض آباد کے حکم کے خلاف ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں تاریخ ۱۳ جنوری ۱۹۸۶ء کو اپیل دائر کی گئی ہے جس میں ڈسٹرکٹ جج نے حکم دیا تھا کہ کلکٹر اور ایس پی عدالت میں یکم فروری ۱۹۸۶ء کو اصالتاً حاضر رہیں۔

یہ سب کچھ معلوم کر لینے کے بعد مسٹر ہاشم نے ایک بجے کے قریب ڈسٹرکٹ جج کی عدالت سے استدعا کی کہ انہیں فائل معائنہ کرنے کی اجازت دی جائے اور انہیں بھی اس اپیل میں فریق بنایا جائے کیونکہ اصل مقدمہ نمبر ۱۲ بابت ۱۹۶۱ء میں وہی مدعی ہیں۔ وکیل کے ذریعہ انہوں نے اس بابت درخواست دائر کی جس پر فاضل ڈسٹرکٹ جج نے خوشی ظاہر کی کہ وہ (محمد ہاشم) عدالت میں رجوع ہوئے کیونکہ فاضل جج فریق ثانی کو بھی سننے کے خواہشمند تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے فریق ثانی کو کوئی نوٹس یا سمن جاری نہیں کیا تھا۔

اس کے بعد محمد ہاشم کے وکیل نے ایک دوسری درخواست داخل کی اور استدعا کی کہ عدالت امیش چند پانڈے کو حکم دے کہ وہ محمد

ہاشم کو اپیل کی نقل اور دیگر طرف ثانیان (Respondent) کی طرف سے دئے گئے جواب کی نقل مہیا کرے تاکہ محمد ہاشم مقدمہ کی ٹھیک طرح سے پیروی کر سکیں۔ اس درخواست پر مقدمہ کی کاروائی کو لنچ کے بعد شروع کرنے کا حکم ہوا۔

لنچ کے بعد مسٹر فاروق حامی ایک صاحب نے ایک درخواست پیش کی جس میں کہا گیا کہ چونکہ وہ مقدمہ نمبر ۲ آف ۱۹۵۰ میں اصل مدعا علیہ کے بیٹے ہیں اور چونکہ ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے، اس لئے انہیں بھی اس اپیل میں فریق بنایا جائے۔

اس کے بعد ڈسٹرکٹ جج نے مرافعہ کے وکیل کی بحث سنی پھر حکومت اتر پردیش، ڈپٹی کمشنر، سٹی مجسٹریٹ، اور ایس پی کے وکیل کی بحث سنی۔ ساڑھے تین بجے مسٹر محمد ہاشم کے وکیل اور مسٹر محمد فارق کے وکیل کی بحث فریق بنانے یا نہ بنانے کے نکتہ پر سنی۔ اور اس کے بعد جج صاحب نے کہا کہ آپ لوگ سوا چار بجے دوبارہ عدالت میں حاضر ہوں۔ سوا چار بجے ڈسٹرکٹ جج نے حکم سنایا۔ فریق بنانے کے لئے دونوں درخواستوں کو مسترد کر دیا۔ نقل کے لئے جو درخواست دی گئی تھی، اس کو بھی خارج کر دیا اور اپیل کو منظور کرتے ہوئے طرف ثانیان Respondents کو حکم دیا کہ "گیٹ او "O" اور "P" کے تالے

فوراً کھول دئے جائیں۔ Respondents درخواست گذار کو پوجا کرنے یا ہندو فرقہ کے کسی ممبر کے پوجا اور درشن میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہیں کریں گے۔"

اس حکم کے صادر ہوتے ہی مسجد کے گیٹ جو کہ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء سے بند تھے منٹوں میں کھول دئے گئے۔ یہی نہیں، حکومت نے اس کی ویڈیو فلم بنائی جو پورے ملک میں ٹی۔ وی پر دکھائی گئی۔ دیکھتے دیکھتے مسجد کو مندر میں تبدیل کر دیا گیا۔ انصاف اور قانون کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ہندو تو مسجد کے اندر اس میں غیر قانونی طور پر رکھی گئی مورتیوں کی پوجا کر سکتے تھے لیکن مسلمان اس کے اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ ضلع حکام نے نہ صرف مسجد کے اندر بلکہ ۵۰۰ میٹر مربع احاطہ میں مسلمانوں کے جانے پر پابندی لگادی تھی۔

نوٹ: مندرجہ بالا پس منظر سپریم کورٹ کے فیصلے میں نہیں ہے بلکہ مصنف نے پیش کیا ہے تاکہ اس تناظر میں سپریم کورٹ کے فیصلے کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

یہ تمام مقدمات فیض آباد کی دیوانی عدالت میں زیر سماعت تھے کہ اتر پردیش کی حکومت کی درخواست پر یہ تمام مقدمات الہ آباد ہائی کورٹ نے خود سماعت کے لئے اپنی لکھنؤ بنچ پر منتقل کر لئے۔ ان مقدمات

کو ہائی کورٹ میں منتقل کئے جانے سے کچھ پہلے دیو کی نندن اگروال نے بابری مسجد کا ایک نیا مقدمہ دائر کیا اور دوسرے مقدمات کے ساتھ یہ مقدمہ بھی یکجائی سماعت کے لئے ہائی کورٹ میں منتقل ہو گیا۔

# بابِ دوم

## صدارتی ریفرینس اور ایودھیا حصول آراضی ایکٹ

اس قانون کی واجبیت اور صدراتی ریفرینس دونوں کو سپریم کورٹ میں چیلیج کیا گیا۔ چیلیج کرنے والوں کا کہنا تھا کہ ۷، جنوری ۱۹۹۳ء کو جاری کردہ آرڈیننس (جو کہ بعد کو قانون بن گیا) خلاف دستور ہونے کے سبب کالعدم قرار دئے جانے کے لائق ہے اور صدارتی رائے طلبی جانب دارانہ ہونے کے باعث اس لائق نہیں ہے کہ سپریم کورٹ اس پر رائے دے۔ اس لئے اس پر کوئی رائے دئے بغیر اسے واپس کر دیا جائے۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ سب سے زیادہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس فیصلہ نے حق ملکیت کے تمام مقدمات کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ اب مسلمانوں کو پھر موقع مل گیا کہ وہ زبانی، واقعاتی اور دستاویزی ثبوت پیش کر کے اور قانونی نکات کی بنیاد پر مسجد پر اپنا دعویٰ ثابت کر سکیں۔ دونوں فریقین کے درمیان نزاع اس بات پر تھی کہ

(الف) کیا شری رام چندر جی اس جگہ پیدا ہوئے تھے جہاں بابری مسجد کی تعمیر ہوئی تھی؟

(ب) کیا بابری مسجد بننے سے پہلے وہاں شری رام مندر تھا اور

(ج) کیا اس مندر کو توڑ کر بابری مسجد بنائی گئی؟

لیکن ریفرینس میں یہ کہا گیا ہے کہ "کیا بابری مسجد سے پہلے وہاں

کوئی ہندو مندر یا ہندو مذہبی نوعیت کی کوئی اور تعمیر موجود تھی " سپریم کورٹ نے یہ کہہ کر اس ریفرینس کو واپس کر دیا کی یہ ایک فرقے کے حق میں جانبدارانہ ( Slanted ) ہے اور یہ کہ اس سے کوئی آئینی مقصد پورا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے نے قانون کی بالادستی اور سیکولر اقدار کی حکمرانی کو ایک بار پھر دو ٹوک اور بااثر انداز میں تسلیم کیا ہے۔

یہ مقدمات الہ آباد ہائی کورٹ (لکھنؤ بنچ) میں زیر سماعت تھے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بھارتیہ جنتا پارٹی ، بجرنگ دل اور وشو ہندو پریشد کے لیڈروں کی شہہ پر (کارسیوکوں کو سپریم کورٹ نے مجرم اور بدمعاش کہا ہے) نے بابری مسجد کو شہید اور پوری طرح مسمار کر دیا اور اس کی جگہ ایک عارضی مندر (Make-Shift Temple) بنا دیا۔ اور وہاں مورتیاں رکھ دیں۔ اس کے بعد، جنوری ۱۹۹۳ء کو مرکزی حکومت نے صدر جمہوریہ کی طرف سے ایک آرڈیننس ( Ordinance ) بہ عنوان ایودھیا میں بعض اراضیات کے حصول کا آرڈیننس جاری کیا جو بعد میں پارلیمنٹ کی توثیق کے بعد " ایودھیا حصول آراضی ایکٹ " ۱۹۹۳ Acquisition of بنا۔ ایکٹ کے certain Areas at Ayodhya Act, 1993) ذریعے حکومت نے وہ قطعہ آراضی جس پر شہادت سے پہلے بابری مسجد

کھڑی تھی اور اس سے ملحقہ جملہ تقریباً ۶۷ ایکڑ زمین ایکوائر (Acquire) کر کے اپنی ملکیت اور تحویل میں لے لیا۔ اور بابری مسجد کے تعلق سے جتنے مقدمات زیر سماعت تھے ان کو سوخت (Abate ) کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ صدر جمہوریہ کی طرف سے دستور ہند کے آرٹیکل (۱) ۱۴۳ کے تحت سپریم کورٹ سے اس بارے میں رائے دینے کی درخواست کی گئی کہ "کیا رام جنم بھومی / بابری مسجد کی تعمیر سے قبل اس مقام پر کوئی ہندو مندر یا کوئی ہندو مذہبی تعمیر موجود تھی۔؟"

## اکثریتی فیصلہ

سپریم کورٹ کا حالیہ تاریخ ساز فیصلہ اسپیشل ریفرینس نمبر ۱ آف ۱۹۹۲ء اور ایودھیا حصول آراضی ایکٹ ۱۹۹۳ء کی آئینیت اور واجبیت سے تعلق رکھتا ہے۔ فیصلے کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ایودھیا حصول آراضی ایکٹ کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کر لی جائیں

## ایودھیا حصول آراضی ایکٹ ۱۹۹۳ء

۷ جنوری ۱۹۹۳ء کو صدارتی رائے طلبی کے ساتھ ساتھ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر

شنکر دیال شرما نے ایودھیا حصول آراضی آرڈیننس جاری کیا۔ بعد میں آرڈیننس کو ہندستانی پارلیمنٹ نے ایکٹ میں تبدیل کردیا۔چونکہ صدارتی ریفرینس اور ایودھیا حصول آراضی ایکٹ ۱۹۹۳ء (Acquisition of certain Areas at Ayodhya Act) ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور دونوں کا مقصد ایک ہے، اس لئے سپریم کورٹ نے ایک ہی فیصلے سے دونوں کا تصفیہ کیا ہے۔

## ایکٹ کا مقصد

۹ مارچ ۱۹۹۳ء کو ہوم منسٹر جناب ایس بی چوان نے ایکٹ کے اغراض و مقاصد ان الفاظ میں بیان کئے۔

"رام جنم بھومی بابری مسجد کی عمارت کا تنازعہ بہت دنوں سے چل رہا ہے جس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد کو کافی بڑھاوا ملا اور بالاخر متنازعہ عمارت ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو مسمار کردی گئی۔اس کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ فساد بھڑک اٹھے جس میں کافی تعداد میں لوگ مرے، زخمی ہوئے اور جائیداد کو نقصان پہنچا۔اس جھگڑے نے امن عامہ اور مختلف فرقوں کے درمیان یکجہتی کو متاثر کیا ہے۔فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ہندستان کے لوگوں میں عام بھائی چارے کی اسپرٹ کو برقرار رکھنے کے لئے حکومت کے ذریعے متنازعہ ڈھانچے کی زمین اور آس پاس کی زمین کا حصول ضروری سمجھا گیا جسے منظم طریقے سے ڈیویلپ

(Develop) کیا جائے تاکہ وہاں پر ایک رام مندر، مسجد اور زائرین کے لئے سہولیات، ایک لائبریری اور میوزیم قائم کیا جاسکے۔ آرڈیننس یا ایکٹ کی رو سے حصول شدہ زمین کی ملکیت، سارے حقوق اور مفاد حکومت ہند کو منتقل ہوگئے۔

## ایکٹ کے چند اہم نکات

(۱) ایکٹ کی رو سے مسجد کی زمین اور اس سے ملحق زمین جس کا کل رقبہ تقریباً ۶۷ ایکڑ ہے، کی ملکیت اور سارے حقوق مالکانہ حکومت ہند کو منتقل ہوگئے

(۲) اس زمین کے تعلق سے جتنے ملکیت، حقوق مالکانہ اور حق استقرار کے دیوانی مقدمے الہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنؤ بنچ کے اسپیشل بنچ میں زیر سماعت تھے، وہ سب سوخت (Abate) ہوگئے۔

(۳) حصول شدہ آراضی کا انتظام مرکزی حکومت کرے گی یا مرکزی حکومت کا نمائندہ کرے گا۔

(۴) مرکزی حکومت یا اس کا نمائندہ اس بات کا مجاز ہوگا کہ وہ ۷، جنوری کے پہلے کی حالت کو جوں کا توں برقرار رکھے۔۔

(۵) حکومت دائمی طور پر اپنی ملکیت میں رکھنے کے بجائے، ان آراضی کو یا اس آراضی کے کسی حصے کو ایسے اتھارٹی، تنظیم یا ٹرسٹ کو دے سکتی ہے جو

حکومت کی شرائط کو، جسے حکومت مناسب سمجھے، پورا کرے۔

(۶) مالکان جن کی زمین حکومت نے حاصل کی ہے، اپنے معاوضے کی رقم کلیم کمشنر (Claim Commissioner) کے سامنے اپنی ملکیت ثابت کر کے لے سکتے ہیں۔ اس کا طریقہ کار کمشنر خود طے کریگا۔ کمشنر کا فیصلہ آخری ہوگا جس کی کوئی اپیل نہیں ہوگی۔

## پس منظر

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں تنازعہ کا پس منظر مختصراً پیش کیا ہے جس میں حکومت کے قرطاس ابیض (White Paper-) کے چند اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔ وہائٹ پیپر میں کہا گیا ہے کہ جو ڈھانچہ بابری مسجد / رام جنم بھومی کے نام سے معروف ہے۔ اسے ۱۵۲۸ء میں شہنشاہ بابر کے ایک سپہ سالار میر باقی نے بنوایا تھا۔ کچھ لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ بابری مسجد کی زمین پر شری رام پیدا ہوئے تھے۔ جہاں پہلے ایک مندر موجود تھا جسے توڑ کر مسجد بنائی گئی۔ تنازعہ ایک نئے دور میں اس وقت داخل ہوا جب ۱۹۴۹ء میں متنازعہ ڈھانچہ میں مورتیاں رکھ دی گئیں۔ اس کے بعد متنازعہ جگہ کو دفعہ ۱۴۵ سی آر پی سی کے تحت عدالتی تحویل میں لے لیا گیا پھر دیوانی مقدمات دائر ہوئے اور فریقین کو عدالت نے وہاں سے مورتیاں

ہٹانے یا پوجا میں کسی طرح کی مداخلت کرنے کی حکم امتناعی کے ذریعہ روک لگادی۔ عملاً دسمبر ۱۹۴۹ء سے ۶ دسمبر ۱۹۹۳ء تک اس عمارت میں نماز نہیں پڑھی گئی۔ (وہائٹ پیپر کے پیراگراف ۱۵۱ اور ۱۵۲)

سپریم کورٹ نے وہائٹ پیپر کے پیراگراف ۱۵۳۶ اور ۱۵۳۹ کو نقل کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ رام جنم بھومی۔ بابری مسجد کی مسماری انتہائی قابل مذمت (Most Reprehensible) عمل ہے۔ جن لوگوں نے عبادت کی جگہ پر حملہ کیا ان لوگوں نے دراصل عبادت کی جگہ پر ہی نہیں بلکہ آئین ہند کے سیکولر کردار، جمہوری اقدار اور قانون کی بالادستی پر حملہ کیا چند ہزار کی تعداد میں کچھ لوگوں نے اچانک اور شرمناک انداز میں ہندستان کے مختلف فرقوں کے کروڑوں لوگوں کے جذبات کو مجروح کردیا جو کچھ ۶، دسمبر ۱۹۹۳ء کو ہوا وہ صرف ایک نظام کی ناکامی نہ تھی، نہ ہی آئین ہند میں موجود دانش و حکمت کی اور نہ ہی رواداری، بھائی چارہ اور باہمی موانست کی بلکہ جیسا کہ اس دن سپریم کورٹ نے لکھا۔۔ "نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اتنے بڑے اور حساس مسئلہ پر ایک آئینی طور پر منتخب شدہ حکومت اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے قاصر رہی" عدلیہ، آئین، پارلیمنٹ اور عوام سے جو وعدے کئے گئے، اس کی پاسداری نہ کی گئی۔ یہ ایک ناکامی بھی ہے اور دغواش گھات (Betrayal) بھی۔

# قومی شرم (National Shame)

## سپریم کورٹ نے بابری مسجد کی مسماری کو پوری ہندستانی قوم کے لئے باعث شرم ورسوائی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"جو کچھ بھی مسمار کیا گیا وہ صرف ایک پرانی تعمیر ہی نہیں تھی بلکہ اکثریت کے احساس عدل اور معقول پسندی پر اقلیت کے بھروسے اور اعتماد پر ایک کاری ضرب تھی جس نے آئینی عمل اور قانون کی بالادستی میں اقلیت کے یقین کو متزلزل کردیا۔ ایک بے یار و مددگار (Defenceless) پانچ سو سالہ قدیم عمارت جس کی حفاظت صوبائی حکومت کے ہاتھوں میں ایک مقدس امانت (Sacred Trust) تھی، توڑدی گئی۔"

"Indeed, it was an act of national shame. What was demolished was not merely an ancient structure, but the faith of the minorities in the sense of justice and fairplay of majority. It shook their faith in the rule of law and al processes. A five hundred year old structure which was defenseless and whose safety was a sacred trust in the hands of the State Government was demolished".

# حکومت ہند کی یقین دہانی (Undertaking)

سپریم کورٹ کے سامنے جب یہ بحث کی گئی کہ ریفرینس مبہم اور بے جان ہے اور یہ کہ اس سے کوئی آئینی مقصد پورا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلم فرقے کی عبادت گاہ ہندو فرقے کے حوالہ کر دیا جائے جو کہ سیکولرازم کے بنیادی اقدار کے خلاف ہے اور سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے سولسٹر جنرل سے اس بارے میں وضاحت چاہی تو انہوں نے حکومت ہند کی طرف سے ۱۴ ستمبر ۱۹۹۴ء کو مندرجہ ذیل تحریری بیان داخل کیا۔۔۔

(۱) حکومت ہند سیکولرزم کے اصولوں اور سارے فرقوں سے یکساں سلوک کی پابند ہے۔ ایودھیا حصول آراضی ایکٹ کا مقصد فرقہ وارانہ ہم آہنگی، امن عامہ (Public Order) اور ہندستان کے شہریوں میں عام بھائی چارہ کے جذبات کو قائم و دائم رکھنا ہے۔

(۲) حکومت رام مندر اور مسجد بنانے کی پابند ہے لیکن جگہ کا تعین صدارتی ریفرینس پر سپریم کورٹ کی رائے آجانے پر کیا جائے گا۔

(۳) حکومت صدارتی ریفرینس پر سپریم کورٹ کی رائے کو عدالتی فیصلہ (Judicial Verdict) مانے گی جو کہ آخری اور بائنڈنگ (Binding) ہوگا۔

(۴) سپریم کورٹ کی رائے کی روشنی میں حکومت اس قضیہ کے

تصفیہ کے لئے صلح اور صفائی کا عمل شروع کرے گی۔ حکومت کو یقین ہے کہ سپریم کورٹ کی رائے کا اچھا اثر فریقین پر پڑے گا اور وہ حریفانہ رویہ اپنانے سے گریز کریں گے۔

(۵) اگر صلح کا عمل ناکام ہو جائے تو حکومت سپریم کورٹ کی رائے کی روشنی میں اپنی طرف سے کوئی حل نافذ کرے گی۔ اس سلسلے میں حکومت کا سلوک دونوں فرقوں کے ساتھ مساویانہ ہوگا۔ اگر ریفرینس کا جواب اثبات میں آتا ہے یعنی بابری مسجد بننے سے پہلے وہاں کوئی ہندو مندر یا کوئی اور ہندو مذہبی تعمیر موجود تھی تو حکومت کا اقدام ہندوؤں کی خواہش کی تکمیل میں ہوگا لیکن اگر جواب منفی میں آتا ہے یعنی بابری مسجد سے پہلے کوئی ہندو مندر یا کسی اور نوعیت کی ہندو تعمیر وہاں نہ تھی تو حکومت کا عمل مسلمانوں کی خواہشات کے مطابق ہوگا۔

# سیکولرزم، مذہبی آزادی اور حق مساوات

ریفرینس کے تعلق سے سپریم کورٹ میں ایک اور بحث یہ کی گئی کہ چونکہ ایکٹ اور ریفرینس دونوں سیکولرزم، مذہبی آزادی اور حق مساوات کے اصولوں سے ٹکراتے ہیں، اس لئے یہ دونوں غیر آئینی ہیں۔ چونکہ مسلمانوں کا مقدمہ منجملہ دیگر کیلئے قبضہ مخالفانہ (Adverse Possession) کے عذر پر بھی مبنی تھا اور وہ اپنے دیوانی حقوق کو ثابت کرسکتے تھے اس لئے ان مقدمات کی چارہ جوئی کے لئے کوئی متبادل عدالتی ذریعہ حل (Alternate Judicial Dispute Resolution Mechanism) فراہم کئے بغیر سوخت (Abate) کردینا غیر آئینی اور انصاف کے اصولوں کے خلاف ہے۔ مزید یہ کہ صدارتی ریفرینس فریقین کے مابین اصل نزاع کے بارے میں خاموش ہے۔ حکومت بغیر حق ملکیت کو طے کئے، متنازعہ آراضی کو کسی باڈی، اتھارٹی یا ٹرسٹ کو منتقل نہیں کرسکتی۔ ایکٹ کے دفعہ ۷ کے مطابق حکومت یا حکومت کا نمائندہ، جنوری ۱۹۹۳ء سے پہلے کی حالت کو جوں کا توں برقرار رکھے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندو تو وہاں پوجا کرتے رہیں گے لیکن مسلمانوں کا کوئی حق نہیں ہوگا اور حکومت اس صورت حال کو جتنے عرصہ تک چاہے طول دے سکتی

ہے۔ دراصل دفعہ ، مسلمانوں کے خلاف شرارت کو جاری رکھنے کا حیلہ ہے۔

## سیکولرزم اور آئین

چونکہ ایکٹ کو سیکولرزم کی بنیاد پر بھی چیلنج کیا گیا تھا اس لئے سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے سیکولرزم پر واضح اظہار خیال کیا ہے جسے اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے:۔

(۱) سیکولرزم آئین ہند کی بنیادی خصوصیت اور روح ہے۔

(۲) ایم سی شیتل واڈ، (M.C. Setalvad) کے چیریٹیبل میموریل لکچر کا حوالہ دیتے ہوئے سپریم کورٹ نے سیکولرزم کو ہندستان کی ابدی ضرورت قرار دیا ہے۔

(۳) اس وقت کے نائب صدر ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل لکچر ۲۹ اپریل ۱۹۸۹ء شانتی نکیتن کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے "Secularism in the Indian Ethos" پر خطبہ پڑھا تھا۔ اس میں انہوں نے مختلف مذہبی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے سیکولرزم کو ہندستان کی روح بتایا ہے۔ ڈاکٹر شرما نے لکھا ہے کہ۔

"عیسائی مذہب اور اسلام مذہب یہاں فوجی طاقت سے نہیں آئے۔ اسلام

اور عیسائی اپنے ساتھ روحانیت اور اخوت انسانی کا تصور لے کر یہاں نمودار ہوئے ۔ اسلام ایک الہامی (Revealed) مذہب ہے ۔ سورہ فاتحہ جسے قرآن کا دل کہا گیا ہے اس میں لفظ رب العالمین آیا ہے جس کا مطلب ہے ساری کائنات کا اللہ جو ساری کائنات کا رازق ہے ۔ اسے صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا گیا ہے ۔"

سورہ بقرہ کی آیت ۴۴ ، ۸۱ اور ۸۲ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ۔ "اصل مذہب کی بنیاد نیک اعمال ہیں ۔"

پھر اکبر اور دارا شکوہ کے سیکولر کردار کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندو مذہب پر صوفی کلچر کا بہت بڑا اثر پڑا ۔ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے آخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ایک خطبے کا ذکر کیا ہے جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا تھا

"ہم افراد اور گروہوں کے درمیان امن چاہتے ہیں یہ ایک دوسرے پر منحصر ہے ۔ اگر حضرت عیسیٰ کے ماؤنٹ سرمن (Sermon of the Mount) ہندو دھرم کے عدم تشدد کا تصور (Hindu concept of Ahimsa) اور اسلام کے تصور توحید ( Passion of Islam to the obedience of the will of God) کو یکجا کر دیا جائے تو ہم امن عالم پر اثر انداز ہو سکتے ہیں ۔"

(۴) ایس آر بومائی بنام یونین آف انڈیا میں سپریم کورٹ کے ۹ ججوں پر مشتمل فیصلہ کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے، یاد رہے کہ اس فیصلہ میں بی جے پی کی ان حکومتوں کو بابری مسجد کی شہادت کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ان کو برخاست کر دئے جانے کو سپریم کورٹ نے جائز قرار دیا تھا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۹۴ء کے اس فیصلے میں سپریم کورٹ نے سیکولرزم کی ایک نئی اور عملی تشریح پیش کی ہے جس کے اہم نکات کو بابری مسجد کے اس فیصلہ میں نقل کیا گیا ہے۔

"مذہبی رواداری سارے مذہبی گروہوں کے ساتھ یکساں سلوک، ان کے جان و مال اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت آئین میں لکھے گئے سیکولرزم کے بنیادی جزو ہیں۔ ہم نے اسے صرف تاریخی روایت کے طور پر قومی یکجہتی کے لئے ہی نہیں چنا بلکہ اسے آفاقی بھائی چارگی اور انسانی قدروں کی بالاتری کے لئے بھی اختیار کیا ہے۔ یہ ہمارا بنیادی عقیدہ ہے اور جو کام بھی اس کے خلاف ہے وہ آئین کے منافی ہے۔"

(جسٹس پی بی ساونت صفحہ ۱۴۷-۱۴۸)

"As stated above, religious tolerance and equal treatment of all religious groups and protection of their life and property and of the places of their worship are an essential part of securlarism enshrined in our . We have accepted the said goal not only because it is our historical legacy and a need of our national unity and integrity but also as a creed of universal brotherhood and humanism. It is our cardinal faith. Any profession and action which go counter to the aforesaid creed are a prima facie proof of the conduct in defiance of the provisions ....."

(at pages 147-48)

"اگرچہ سیکولرزم سے کیا مراد ہے اسے واضح طور پر آئین میں نہیں لکھا گیا ہے لیکن بنیادی حقوق اور رہنما اصولوں میں یہ صاف طور پر نظر آتا ہے۔ حالانکہ اسے ۴۲ ویں ترمیم کے ذریعے آئین کے ابتدائیہ میں درج کیا گیا لیکن اس کی روح پہلے سے موجود تھی۔ حکومت کسی خاص مذہب کو دوسرے مذہب کے مقابلے میں ترجیح نہیں دے سکتی۔ اینٹی سیکولر طاقتیں مختلف مذہبی گروہوں میں اس طرح سے نفرت پھیلا رہی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر انہیں ایسا کرنے سے نہ روکا گیا تو جمہوریت باقی نہیں رہے گی۔ ایک سیکولر حکومت کو ایسی کوششوں کو ناکام بنا کر سماج میں امن قائم کرنا چاہیئے۔ (جسٹس کے راماسوامی صفحہ ۱۶۳)

".....Though the concept of 'secularism' was not expressly engrafted while making the Constitution , its sweep, operation and visibility are apparent from fundamental rights and directive principles and their related provisions. It was made explicit by amending the preamble of the Constitution 42nd Amendment Act. The concept of secularism of which religious freedom is the foremost appears to visualize not only of the subject of God but also an understanding between man and man. Secularism in the Constitution is not anti-God and it is some times believed to be a stay in a free society. Matters which are purely religious are left personal to the individual and the secular part is taken charge by the State on grounds of public interest, order and general welfare. The State guarantee individual and corporate religious freedom and dealt with an individual as citizen irrespective of his faith and religious belief and does not promote any particular religion nor prefers one against another. The concept of secular state is, therefore, essential for successful working of the democratic form of Government. There can be no democracy if anti-secular forces are allowed to work dividing followers of different religious faith flying at each other's throats. The secular Government should negate the attempt and bring order in the society. Religion in the positive sense is an active instrument to allow the citizen full development of his person, not merely in the physical and material but in the non-material and non-secular life."

(at page 163)

معدوم ہو جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں یقین دلایا جائے
کہ یہ ملک ان کا بھی ہے۔ اگرچہ مکمل انصاف حاصل کرنا ناممکن ہے
لیکن اسے اتنا تو کرنا چاہیئے کہ سب کے مفاد کا لحاظ ہو تقسیمی انصاف،
مایوسی دور کرنے اور تحفظ فراہم کرنے کے اصول کی کارفرمائی ہونی چاہیئے

".... The purpose of the law must be not to extinguish the groups which make the society but to devise political, social and legal means of preventing them from falling apart and so destroying the plural society of which they are members...."

"To those that live in fear and insecurity all the joys and bright colours of life are etched away. There is need to provide a reassurance and a sense of belonging. It is not enough to say "look here..... I never promised you perfect justice". But perfect justice may be an unattainable goal. At least it must be a tolerable accommodation of the conflicting interests of society. Though there may really be no "Royal road to attain such accommodation concretely". Benthan alluded to the pursuit of equality as disappointment-preventing principle as the principle of distributing justice and part of the security-providing principle".

اس سوال کا جواب دینے کے لئے کہ ایودھیا آراضی ایکٹ اینٹی
سیکولر اور ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کی شرارت کو قائم و دائم رکھنے کا حیلہ ہے۔ یہ ضروری
ہے کہ ۶ دسمبر سے پہلے کے حالات کا مختصر جائزہ لیا جائے اور دونوں فریق
کے Comparative use کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ اس بات پر کوئی
جھگڑا نہیں ہے کہ مسجد کے باہری صحن میں بنے رام چبوترہ پر مورتیوں کی
پوجا ہندو کرتے تھے اور مسلمانوں کی طرف سے ۱۹۴۹ء تک جب
مورتیاں رام چبوترے سے ہٹا کر مسجد کے اندر رکھ دی گئیں اس پر کو

اعتراض نہیں تھا۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں عدالت نے عبوری حکم امتناعی جاری کرکے مورتیوں کو وہاں سے ہٹانے پر پابندی لگادی اور ہندو وہاں پوجا کرتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں ہائی کورٹ نے اس حکم امتناعی کی توثیق کردی۔ یکم فروری ۱۹۸۶ء کو ڈسٹرکٹ جج نے گریل (Grill) پر لگے تالے کھلوادئے اور اس کے بعد ہندو بھاری تعداد میں اندر جاکر پوجا کرنے لگے اور یہ حالت ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء تک قائم رہی، ۶ دسمبر کو مسجد کے ساتھ ساتھ رام چبوترہ کو بھی توڑدیا گیا۔ مسجد ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر بڑی تعداد میں پوجا کرنے پر بھی اثر پڑا۔ ۶ دسمبر ۹۲ء کے بعد سے وہاں صرف ایک پجاری پوجا کرتا ہے۔ اس طرح سے مورتیوں کی پوجا میں زبردست کمی آگئی۔ دوسری طرف ۱۹۴۹ء سے وہاں نماز نہیں پڑھی گئی اگرچہ بعد میں مقدمات کے فیصلے سے یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کو وہاں نماز پڑھنے کا حق تھا۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد جو تشدد پھوٹ پڑا اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کسی بھی ایسے اقدام کو سیکولر مخالف نہیں کہا جاسکتا جس سے حالات کو مزید بگڑنے سے روکنے میں مدد ملے اور جس سے فرقہ وارانہ میل جول کو بڑھانے میں مدد ملے۔

## دونوں فریق متاثر

ایودھیا حصول آراضی ایکٹ سے دونوں فرقوں کے حقوق متاثر ہوئے ہیں۔ صرف مسلم فرقے کے ہی نہیں۔ مسلمانوں کا دعویٰ صرف اس زمین پر ہے جس پر مسجد کھڑی تھی۔ اکوائر کی گئی پوری زمین پر نہیں۔ اس زمین کی ملکیت کا فیصلہ دیوانی مقدمات میں ہوتا ہے۔ اس متنازعہ زمین کے علاوہ جو زمین حاصل کی گئی ہے اس پر مسلمانوں کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ زمین کو حاصل کرنا بنیادی مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے تاکہ اگر مسلمان ملکیت کے مقدمات جیت جاتے ہیں تو بابری مسجد کی زمین انہیں دینے کے ساتھ وہاں آنے جانے کے لئے راستہ اور حق انتظار کے استعمال کے لئے درکار زمین بھی دی جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو بابری مسجد زمین آنے جانے کا راستہ نہ ہونے کی بناء پر بیکار ثابت ہوگی اس مقصد کے لئے سیتا کی رسوئی اور مانس بھون وغیرہ کا حصول بھی ہندوؤں کی غیر نزاعی ملکیت ہے، مناسب اور آئینی ہے۔ ایودھیا حصول آراضی ایکٹ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کامیابی کی صورت میں مسلمان بابری مسجد کی زمین کو بلا شرکت غیرے اور بغیر روک ٹوک کے موثر طریقے سے اپنے استعمال میں لا سکیں اور کامیابی کے ثمر سے بہرہ ور ہو سکیں چونکہ فاضل آراضی متنازعہ آراضی کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اس لئے آس پاس کے مندر یا مذہبی عمارتوں کو حاصل کرنا مناسب

آئینی ہے۔ یہ عدالت پہلے بھی عبادت گاہوں کے حصول کو مناسب اور آئینی قرار دے چکی ہے۔ ہم ان اصولوں کی تائید کرتے ہیں کیونکہ اُن سے ایک بڑا مقصد پورا ہوتا ہے۔

ایودھیا حصول آراضی ایکٹ کا مقصد پورا ہو جانے پر باقی ماندہ زمین اس کے مالکان کو واپس کر دی جائے گی اور بعد میں مالکان دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اب چونکہ ان کی زمین کی ضرورت باقی نہیں رہی، اس لئے ان کی زمین واپس کی جائے۔

## دونوں فرقوں کے لئے اہم

جیسے ایودھیا ہندوؤں کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ بھگوان رام وہاں پیدا ہوئے تھے۔ یہ مسجد بھی مسلمانوں کے لئے اہم تھی کیوں کہ یہ ایک قدیم مسجد تھی جسے میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں بنوایا تھا۔ مسجد کے طور پر یہ مسلمانوں کے لئے جائے عبادت ہے۔ حصول آراضی کا اثر دونوں فریقوں کے حقوق پر یکساں پڑا۔

## ہندوؤں کے حقوق محدود

ایکٹ کی دفعہ ۷ (۲) نے ۷ جنوری ۱۹۹۳ء کی حالت کو منجمد (Freeze) کر دیا

ہے اب وہاں عوامی اور عمومی پجا کی اجازت نہیں ہوگی بلکہ جیسا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء، ۷ جنوری ۱۹۹۳ء تک ہوتا آیا ہے، صرف ایک پجاری پوجا کرے گا۔ ۷ جنوری ۱۹۹۳ء کی حالت کو برقرار رکھنے سے نہ ہی کوئی نئی صورت حال پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی ہندوؤں کے پوجا کرنے کے حق میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی ہندوؤں کو کوئی نیا حق ملتا ہے۔ محدود پوجا کو ہرگز ہندوؤں کے حق میں توسیع نہیں کہا جاسکتا اور ۷ جنوری کی حالت بحال رہے گی۔

## پوری ہندو قوم ذمہ دار نہیں

"یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جو لوگ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو مسجد توڑنے کے ذمہ دار ہیں وہ چند شرارتی لوگ تھے جن کو سارے ہندو سماج کی شناخت پر محیط نہیں کیا جاسکتا اور اس طرح سے چند شریر لوگوں کی غنڈہ گردی کو ساری ہندو فرقہ کی غنڈہ گردی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوؤں کی طرف سے شدید رد عمل اور مذمت اس بات کی دلیل ہے۔ دوسری مثال بھارتیہ جنتا پارٹی کی اسمبلی چناؤ میں شکست ہے۔ جن شر پسندوں نے مسجد کو مسمار کیا ان کی حقیقت صرف مجرم کی ہے اور ان کا تعلق کسی مذہب، ذات یا برادری سے نہیں۔ چونکہ ایسے لوگ اتفاق سے ایک خاص مذہب میں پیدا ہوئے اس لئے پورے ہندو مذہب پر ان کے گناہ کا داغ

نہیں لگنا چاہیئے۔"

" It is also pertinent to bear in mind that the persons. responsible for demolition of the mosque on 6 Dec. 1992 were some miscreants who cannot be identified and equated with the entire Hindu community and. therefore. the act of vandalism so perpetrated by the miscreants can not be treated as an act of the entire Hindu community for the purpose of adjudging the constitutionality of the enactment. Strong reaction against. and condemnation by the Hindus of the demolition of the structure in general bears eloquent testimony to this fact. Rejection of Bhartiya Janata Party at the hustings in the subsequent elections in Uttar Pradesh is another circumstance to that effect. The miscreants who demolished the mosque had no religion, caste or creed except the character of a criminal and the mere incident of birth of such a person in any particular community cannot attach the stigma of his crime to the community in which he was born".

## اینٹی سیکولر نہیں

چونکہ ہندوؤں کا پوجا کرنے کا عوامی حق محدود ہو کر ایک پجاری کی پوجا تک محدود ہو گیا ہے، اس لئے دفعہ ۷ (۲) کو اینٹی سیکولر، غیر سیکولر یا ہندوؤں کے حق میں جانبدارانہ نہیں کہہ سکتے۔ چونکہ جن شرپسندوں نے مسجد کو توڑا، ان کا تعلق ہندو دھرم سے تھا اس لئے، جنوری ۱۹۹۳ء کی حالت کو محفوظ کر کے ہندوؤں کے حق پوجا کو محدود کرنا مناسب اور درست ہے۔

چونکہ ان شرپسندوں کا تعلق موجودہ معقول ہندو دھرم سے تھا اس لئے تمام فرقہ کو ان کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔

# متبادل عدالتی چارہ جوئی (Judicial Remedy Alternate) مفقود

چونکہ صدارتی رائے طلبی ایک ایسے امر پر کی گئی ہے جس کا اصل تنازعہ سے کوئی تعلق نہیں اور ساتھ ہی حق ملکیت کے تمام مقدمات کالعدم کردیئے گئے ہیں جس سے مسلمانوں کا قانونی دفاع کا حق بھی ختم ہوگیا لیکن حق ملکیت کے تصفیہ کے لئے کوئی متبادل قانونی ذریعہ تجویز نہیں کیا گیا ہے اس لئے قانون کی دفعہ ۴۳(۳) کو باطل اور غیر آئینی قرار دیتے ہوئے تمام مقدمات کو زندہ کیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ تمام مقدمات کے زندہ ہوتے ہی وہ تمام عبوری احکامات جو ہندوؤں کو عوامی پوجا کا حق عطا کرتے ہیں، وہ بھی زندہ ہو جائے گا اس لئے ان مقدمات کو اس تحدید کے ساتھ زندہ کیا جاتا ہے کہ ایکٹ کے دفعہ ۷ (۲) کے مطابق ، جنوری ۱۹۹۳ء کی حالت برقرار (Freeze) رہے گی اور صرف ایک پجاری کو پجا کرنے کی اجازت ہوگی۔

## حکومت قانونی ریسیور

بابری مسجد کی جو اصل زمین ہے اور جس پر حق ملکیت کے مقدمات زیر سماعت ہیں، حکومت اسے بھی قانونی ریسیور کے طور پر اپنی تحویل میں رکھے گی اور جب ملکیت کے مقدمات فیصل ہو جائیں گے تو کامیاب فریق کو دخل و قبضہ سونپ دے گی۔ چونکہ متنازعہ جگہ آخر کار کامیاب فریق کے حوالہ کی جانی ہے اس لئے اس سلسلے میں معاوضہ کی رقم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فاضل زمین کو حکومت محدود تحویل دار کے طور پر اپنے قبضہ میں رکھے گی اگر مسلمانوں کو مقدمہ میں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کے اس مسجد تک آنے جانے اور دوسرے حقوق انتفاع کے لئے جتنی زمین کی ضرورت ہو وہ ان کو دی جائے گی اور باقی زمین مالکان کو واپس کر دی جائے گی۔

## حصول آراضی ایکٹ اور مسجد

اس دلیل کو مسترد کرتے ہوئے کہ مسجد یا مسجد کی زمین فرش سے عرش تک اور قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اس لئے حکومت اسے ایکوائر (Acquire) نہیں کر سکتی، سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ اور عبادت گاہوں کی طرح مسجد بھی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن چند شرائط کے ساتھ۔

(۱) اپنے مقتدر اعلیٰ (Soverign Power) ہونے کی بنیاد پر حکومت

مسجد کو یا کسی بھی اور فرقہ کی عبادت گاہ کو ایکوائر کر سکتی ہے بشرطیکہ ایسا عمل

(۲) عظیم تر قومی مفاد میں ہو۔

(۳) غیر معمولی حالات ہوں

(۴) اگر مسجد کسی ایسی خاص اہمیت کی حامل نہ ہو جس میں نماز پڑھنا مذہب کا لازمی جزو قرار دیا گیا ہو۔

(۵) مسجد میں نماز پڑھنا اور مندر میں پوجا کرنا دیوانی حقوق ہیں۔

(۶) مسجد شہید گنج وغیرہ بنام شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر کے فیصلے میں قرار دیا گیا ہے کہ اگر کسی مسجد پر غیر مسلموں کا قبضہ مخالفانہ ثابت ہو جائے تو مسجد اپنی مقدس حیثیت کھو دیتی ہے اور جائیداد یا زمین پر حق ختم ہونے کے ساتھ اس میں نماز پڑھنے کا حق بھی ختم ہو جاتا ہے۔

(۷) حصول آراضی ایکٹ کا اطلاق ہر طرح کے جائے عبادت پر ہوتا ہے اور اس سلسلے میں مسجد کا مقام دوسرے مذہب کی عبادت گاہوں سے افضل یا منفرد نہیں ہے اور نہ ہی اسے کوئی زیادہ تحفظ حاصل ہے۔

(۸) نماز پڑھنا مذہب کا لازمی جزو ہے لیکن کسی خاص جگہ پر ہی نماز کا پڑھنا یہ مذہب کا لازمی جزو نہیں ہے جب تک کہ اس خاص جگہ یا مسجد کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو اور جہاں نماز پڑھنا مذہب کا لازمی جزو قرار دیا گیا ہو۔

# نتیجہ

(۱) ایودھیا حصول آراضی ایکٹ ۱۹۹۳ء آئینی ہے بجز دفعہ ۴(۳) کے جسے باطل اور غیر آئینی قرار دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ملکیت کے سارے مقدمات زندہ ہو جائیں گے لیکن متنازعہ جگہ پر ایکٹ کے دفعہ ۷، (۲) کے مطابق، جنوری ۱۹۹۳ء کی حالت منجمد (Freeze) رہے گی۔

(۲) صدارتی ریفرینس غیر ضروری ہے، اس لئے اس کا جواب دینے سے انکار کرتے ہوئے اسے واپس کیا جاتا ہے۔

(۳) بابری مسجد کی اصل زمین پر حکومت کی حیثیت قانونی ریسیور کی ہوگی۔ اور مقدمات کے فیصل ہونے کے بعد حکومت اسے کامیاب فریق کو سونپ دے گی۔

(۴) مندرجہ بالا احکام کی روشنی میں فریقین کو اپنے اپنے دعووں میں ترمیم کرنے کی آزادی ہوگی۔

(۵) دفعہ ۷، (۲) کے مطابق ہندوؤں کو محدود طور پر پوجا کا حق حاصل رہے گا جس کو کسی بھی صورت میں وسعت نہیں دی جائے گی۔

(۶) اگر ہم پورے ایکٹ کو باطل قرار دے دیتے تو سارے مقدمات کے زندہ ہونے کے ساتھ ساتھ سارے عبوری حکم بھی زندہ ہو جاتے جس کی

رو سے ہندوؤں کو عوامی پوجا کا جواز مل جاتا اور مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور مسجد کی مسماری کے بعد جس انداز میں ان کے جذبات مجروح ہوئے ان کی تسکین بھی نہ ہو پاتی۔

" This result could be no solace to the Muslims whose feelings of hurts as a result of the demolition of mosque must be assuaged in the manner best possible without giving cause for any legitimate grievance to the other community leading to the possibility of reigniting communal passions detrimental to the spirit of communal harmony in a secular state".

## (۷) بات چیت کے ذریعہ حل

اگر بات چیت کے ذریعے مسئلہ کا حل ہو جائے تو یہ سب سے عمدہ بات ہوگی اور قومی مفاد کو تقویت پہنچے گی۔ کوئی بھی فریق اپنے آپ کو شکست خوردہ یا کھونے والا (Loser) نہیں سمجھے گا۔ صلح کی صورت میں کسی فریق کے دل میں کدورت باقی نہیں رہے گی۔ صلح کی شرطوں کی بنیاد پر عدالتی ڈگری حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا حل ہوگا جس سے سب ہی خوش و مطمئن ہوں گے۔

" It is in the national interest that there is no loser at the end of the process adopted for resolution of the dispute so that the final outcome does not leave behind any rancour in any one".

# اقلیتی فیصلہ

دونوں فیصلوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں میں صدارتی
رینس کو مبہم اور غیر ضروری قرار دے کر رائے دینے سے انکار کیا گیا ہے
واپس کر دیا گیا۔ اقلیتی فیصلہ میں حکومت کے ذریعے بابری مسجد کی
ارہ تعمیر کا ذکر کیا گیا ہے۔ دونوں فیصلوں میں ایس آر بومائی بنام یونین
انڈیا میں ۹ ججوں کے فیصلہ کا ذکر کرتے ہوئے سیکولرزم کو آئین کا
دی اور لازمی جزو بتایا گیا ہے۔ اقلیتی فیصلے میں کہا گیا ہے کہ چونکہ
رینس میں اصل جھگڑے یعنی رام کی جائے پیدائش، رام مندر کی تعمیر،
مندر کو توڑ کر بابری مسجد کی تعمیر کا ذکر نہیں ہے اس لئے اس ریفرینس
ائے دینے سے کوئی مقصد پورا نہیں ہوگا۔

## ۱۱ ایکٹ غیر آئینی

اکثریتی فیصلے میں بجز دفعہ ۴(۳)، جس کی رو سے تمام ملکیت کے
مات کالعدم ہو گئے تھے، پورے ایکٹ کو درست اور آئینی قرار دیا گیا
جب کہ اقلیتی فیصلے میں پورے ایودھیا حصول آراضی ایکٹ کو غیر
ذل اور غیر آئینی قرار دیا گیا ہے جس کی مندرجہ ذیل وجوہات بتائی گئی

(۱) ایکٹ کے دفعہ ۷(۲) کے مطابق حکومت یا اس کا نمائندہ
اس ایکٹ کے نفاذ سے پہلے کی حالت کو جوں کا توں بر قرار رکھے گا۔ اس
ایکٹ کے نفاذ کے پہلے مسجد ٹوٹ چکی تھی، مورتیاں متنازعہ جگہ پر رکھی ج
چکی تھیں اور پوجا شروع ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دفعہ ۷(۲) کے
مطابق پوجا اس وقت تک ہوتی رہے گی جب تک متنازعہ جگہ کا انصرا
حکومت یا اس کے نمائندہ کے ہاتھ میں ہو گا۔ یہ انصرام کب تک حکومت
اس کے نمائندہ کے ہاتھ میں رہے گا یا کیا ہونے پر یہ انصرام ختم ہو جائے
ان باتوں کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔

(۲) اس بات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ اس عمارت
نہایت قابل مذمت انداز میں توڑا گیا۔ مسماری کے ذمہ داروں نے ایک
عبادت گاہ پر ہی نہیں بلکہ سیکولرزم اور جمہوریت کے اصولوں اور قانو
کی حکمرانی پر بھی وار کیا۔ اس بات کا بھی دھیان نہیں رکھا گیا کہ جہا
مسماری کے بعد پوجا ہو رہی ہے وہ متنازعہ فیہ زمین ہے۔ اس بات کا
لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، جیسا کہ حکومت کے قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر)
ذکر ہے کہ ۱۹۴۹ء سے پہلے وہ جگہ مسجد کے طور پر استعمال ہوتی تھی
مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہاں نماز پڑھنے کا ان کا حق باقی ہے

(۳) عبادت گاہ ایکٹ ۱۹۹۱ء کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے
چونکہ اس ایکٹ کے تحت عبادت گاہوں کی ۱۵، اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے

حالت بر قرار رہے گی اور اسے کسی دوسرے فرقے یا مذہب کی عبادت گاہ میں تبدیل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اس لئے اب دوبارہ ایودھیا والی کیفیت ملک میں پیدا نہیں ہوگی۔ یہاں اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ کسی مذہبی مقام کی بے حرمتی پہلے ہی سے تعزیرات ہند کی دفعات ۲۹۵ اور ۲۹۵ (الف) کے تحت ایک جرم ہے۔ لیکن ان دفعات کے ہوتے ہوئے بھی کچھ لوگوں نے متنازعہ عمارت کو زمین بوس کر دیا۔ مذہبی عبادت گاہ ایکٹ آئندہ ایسے لوگوں پر روک لگانے میں شاید ہی مؤثر ثابت ہو۔

(۴) ایودھیا حصول آراضی ایکٹ میں کہا گیا ہے کہ معاوضے کی رقم لینے کے لئے مالکان کو معاوضہ کمشنر کے سامنے اپنی ملکیت ثابت کرنی پڑے گی۔ یعنی ملکیت کے فیصلے کا اختیار دیوانی عدالت کے ہاتھ سے لے کر معاوضہ کمشنر کو دے دیا گیا ہے جو غیر آئینی ہے ایکٹ کی رو سے کمشنر کا فیصلہ آخری ہوگا اور اس کے خلاف اپیل دائر نہیں ہو سکتی۔ یعنی کمشنر کے حکم یا فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں صرف آرٹیکل ۲۲۶ اور ۲۲۷ کے تحت چارہ جوئی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی نامناسب اور غیر قانونی ہے۔

(۵) ایکٹ نے بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ سے متعلق ملکیت کے سارے مقدمات کو کالعدم کر دیا ہے۔ پانچ سو سالوں تک وہ جگہ مسجد کے طور پر استعمال ہوئی۔ ۲۲، اور ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب سے پہلے تک اس میں نماز ہوتی تھی۔ اس طرح سے ملکیت کے مقدمات

(۱) ایکٹ کے دفعہ ۷(۲) کے مطابق حکومت یا اس کا نمائندہ
اس ایکٹ کے نفاذ سے پہلے کی حالت کو جوں کا توں بر قرار رکھے گا۔ اس
ایکٹ کے نفاذ کے پہلے مسجد ٹوٹ چکی تھی، مورتیاں متنازعہ جگہ پر رکھی جا
چکی تھیں اور پوجا شروع ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دفعہ ۷(۲) کے
مطابق پوجا اس وقت تک ہوتی رہے گی جب تک متنازعہ جگہ کا انصرا
حکومت یا اس کے نمائندہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ یہ انصرام کب تک حکومت
اس کے نمائندہ کے ہاتھ میں رہے گا یا کیا ہونے پر یہ انصرام ختم ہو جائے گ
ان باتوں کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔

(۲) اس بات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ اس عمارت
نہایت قابل مذمت انداز میں توڑا گیا۔ مسماری کے ذمہ داروں نے ایک
عبادت گاہ پر ہی نہیں بلکہ سیکولرزم اور جمہوریت کے اصولوں اور قانو
کی حکمرانی پر بھی وار کیا۔ اس بات کا بھی دھیان نہیں رکھا گیا کہ جہا
مسماری کے بعد پوجا ہو رہی ہے وہ متنازعہ فیہ زمین ہے۔ اس بات کا بھ
لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، جیسا کہ حکومت کے قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر) مب
ذکر ہے کہ ۱۹۴۹ء سے پہلے وہ جگہ مسجد کے طور پر استعمال ہوتی تھی ا
مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہاں نماز پڑھنے کا ان کا حق باقی ہے

(۳) عبادت گاہ ایکٹ ۱۹۹۱ء کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے
چونکہ اس ایکٹ کے تحت عبادت گاہوں کی ۱۵، اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے

الت بر قرار رہے گی اور اسے کسی دوسرے فرقے یا مذہب کی عبادت گاہ
ں تبدیل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اس لئے اب دوبارہ ایودھیا والی
یفیت ملک میں پیدا نہیں ہوگی۔ یہاں اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے
۔ کسی مذہبی مقام کی بے حرمتی پہلے ہی سے تعزیرات ہند کی دفعات ۲۹۵
ر ۲۹۵ (الف) کے تحت ایک جرم ہے۔ لیکن ان دفعات کے ہوتے
وئے بھی کچھ لوگوں نے متنازعہ عمارت کو زمین بوس کر دیا۔ مذہبی عبادت
اہ ایکٹ آئندہ ایسے لوگوں پر روک لگانے میں شاید ہی مؤثر ثابت ہو۔

(۴) ایودھیا حصول آراضی ایکٹ میں کہا گیا ہے کہ معاوضے کی
قم لینے کے لئے مالکان کو معاوضہ کمشنر کے سامنے اپنی ملکیت ثابت کرنی
ڑے گی۔ یعنی ملکیت کے فیصلے کا اختیار دیوانی عدالت کے ہاتھ سے لے کر
معاوضہ کمشنر کو دے دیا گیا ہے جو غیر آئینی ہے ایکٹ کی رو سے کمشنر کا
فیصلہ آخری ہوگا اور اس کے خلاف اپیل دائر نہیں ہو سکتی۔ یعنی کمشنر
کے حکم یا فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں صرف آرٹیکل ۲۲۶ اور ۲۲۷ کے
تحت چارہ جوئی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی نامناسب اور غیر قانونی ہے۔

(۵) ایکٹ نے بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ سے متعلق
ملکیت کے سارے مقدمات کو کالعدم کر دیا ہے۔ پانچ سو سالوں تک وہ
جگہ مسجد کے طور پر استعمال ہوئی۔ ۲۲، اور ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب
سے پہلے تک اس میں نماز ہوتی تھی۔ اس طرح سے ملکیت کے مقدمات

میں مسلمانوں کو قبضہ مخالفانہ کی بنیاد پر حق مالکانہ حاصل ہے جس کی بنیا
پر وہ مقدمات جیت سکتے تھے۔ مقدمات کے کالعدم ہونے کے ساتھ ساتھ
ان کا یہ دیوانی حق بھی منسوخ ہو گیا جو کہ سراسر ناانصافی ہے خاص طور
ایسی صورت میں کہ کسی متبادل عدالتی چارہ جوئی کا انتظام بھی نہیں کیا گ
اور جو کیا بھی گیا یعنی (صدارتی ریفرلیسن) اس سے متنازعہ کا حل ممکن نہیں

نوٹ: اوپر جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ سپریم کورٹ
کے فیصلے کی تلخیص (Synopsis) ہے اس میں مصنف نے اپنا نظر
دانستہ طور پر اس لئے پیش نہیں کیا ہے تاکہ پس منظر کے تناظر میں عا
قاری سپریم کورٹ کے اس فیصلہ پر اپنی رائے قائم کر سکے۔ یہ اس
ضروری ہے کہ اس فیصلے کے بارے میں لوگوں کی رائیں مختلف ہیں
کوئی اسے مژدہ جانفزا قرار دیتا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ یہ فیصلہ انصاف
تقاضوں کو پورا نہیں کرتا میری رائے میں یہ فیصلہ موجودہ صورت حال
غنیمت ہے۔

## صدارتی رائے طلبی کی ضرورت کیوں پڑی؟

جیسا کہ اوپر دئے ہوئے پس منظر سے ظاہر ہے کہ بابری مسجد
تعلق سے جتنے حق ملکیت کے مقدمے زیر سماعت ہیں، ان میں مسلمانو
کا کیس بہت مضبوط ہے۔ ایف۔ آئی۔ آر اور مختلف مقدمات میں حکوم

اتر پردیش کی طرف سے داخل کئے گئے جواب دعویٰ کے علاوہ بے شمار ایسے دستاویزات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بابری مسجد مسجد تھی۔ اس کے اندر مورتیاں چوری چھپے اور غیر قانونی طور سے ۲۲ اور ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب میں رکھ دی گئیں۔ مقدمات الہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنؤ بنچ میں زیر سماعت تھے۔ مقدمات کی بنیادی کارروائیاں مکمل ہو چکی تھیں۔ تمام مقدمات میں مدعا علیہم کے جواب دعوے داخل ہو چکے تھے۔ تمام متفرق درخواستوں کا تصفیہ ہو چکا تھا اور پلیڈنگ کی روشنی میں تنقیحات قائم ہو چکی تھیں اور شہادت پیش کرنے کا مرحلہ آگیا تھا۔ اب وقت آگیا تھا وہ ایف آئی آر، جو ایک ہیڈ کانسٹیبل ماتا دین نے درج کرائی تھی، اور جس میں صراحتاً کہا گیا تھا کہ چوری چھپے غیر قانونی طور پر مسجد کے اندر مورتیاں رکھ دی گئیں ہیں کو ثابت کرنے کا۔ اب وقت آگیا تھا یہ ثابت کرنے کا کہ نویں صدی سے لیکر اب تک کے سرکاری دیوانی ریکارڈ (Revenue Records) میں اس عمارت کو مسجد کے طور پر دکھایا گیا ہے، کہیں بھی اس کا مندر کے طور پر ذکر نہیں ہے۔

مسلمانوں کے حق میں دستاویزات اور دوسرے ناقابل تردید ثبوت اتنے پکے تھے کہ کوئی بھی دیوانی عدالت اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اب مقدمات میں مہلت لینا بھی ممکن نہیں تھا۔ فسطائی طاقتوں نے اندازہ کر لیا کہ لکھنؤ عدالت کا فیصلہ ان کے خلاف جائے گا۔ اس لئے

یہ منصوبہ بند سازش کی گئی کہ مسجد ہی توڑ دو تاکہ مسلمانوں کا سب سے بڑا موجود ثبوت ہی ختم ہو جائے۔

ان سب کے علاوہ مسلمانوں کو متبادل بنیاد کے طور پر حق قبضۂ مخالفانہ حاصل تھا یعنی یہ حقیقت تھی کہ کئی سو سالوں سے مسلمان اسے مسجد کے طور پر ۱۹۴۹ء تک استعمال کرتے آئے تھے۔ ایسی صورت میں اگر ابتدا میں وہاں مسجد کا وجود یا اس میں نماز ادا کرنا غیر قانونی تھا بھی تو مسجد پر ان کے چار سو سال سے زیادہ عرصہ تک علانیہ مسلسل اور غیر منقطع قبضہ و تصرف کے باعث مسلمانوں کے مالکانہ حقوق مکمل ہو گئے تھے۔

ماہر آئین مسٹر ایچ ایم سروائی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا حق قبضۂ مخالفانہ (Adverse Possession & Prescriptive Right) اتنے مضبوط ہیں کہ ہندوستان کی کوئی بھی عدالت اسے نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اسی حق کی بنیاد پر سکھ اپنا مقدمہ مسجد شہید گنج لاہور کے سلسلہ میں جیت گئے تھے۔

ہوا یہ تھا کہ یہاں مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانے میں جب لاہور پر حملہ ہوا تو سکھوں نے مسجد شہید گنج (۱۷۶۲-۱۷۲۶) کو جزوی طور پر مسمار کر کے وہاں ایک گوردوارہ بنا دیا جس پر قبضہ کئی سالوں تک ان کے پاس رہا۔ بعد میں مسلمانوں کی طرف سے اس مسجد کی بازیابی کے لے

زبردست تحریک چلی۔ مقدمات کا سلسلہ چلا۔ لاہور ہائی کورٹ میں سکھ مقدمہ حق قبضہ مخالفانہ(Adverse Possession ) کی بنیاد پر جیت گئے۔

اپیل میں پریوی کونسل(Privy Council) میں بھی مقدمہ جیت گئے ۔ پاکستانی مسلمانوں کی طرف سے اس فیصلے کے خلاف زبردست احتجاج ہوا لیکن حکومت نے سختی سے اس پر عمل کیا۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسجد شہید گنج ہونا ثابت تھا لیکن چونکہ اس سے مسلمان ایک طویل عرصہ تک بے دخل رہے تھے اور اس پر سکھوں کا قبضہ کئی سالوں تک رہا تھا اس بنیاد پر وہ مقدمہ جیت گئے۔

مسلمانوں کے حق میں مسجد شہید گنج لاہور کے مقدمہ کی مستحکم قانونی نظیر موجود تھی جو اس وقت کی اعلیٰ ترین عدالت یعنی ہر پریوی کاؤنسل کے فیصلہ سے قائم ہوئی تھی۔ مسجد شہید گنج جس کی تعمیر ۱۷۲۶ء میں ہوئی تھی اس پر سکھوں نے ۱۷۶۲ء میں زبردستی قبضہ کر کے اسے گوردوارہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ سکھوں نے بارہ سال سے زیادہ عرصہ تک مسلسل قبضہ مخالفانہ کے ذریعہ مالکانہ حقوق حاصل کر لئے تھے اور مسلمانوں نے میعاد کے اندر اپنا دعوی دائر نہیں کیا تھا اس لئے جائداد کی ملکیت کا فیصلہ سکھوں کے حق میں ہوا۔ دیکھئے

AIR 1938 LAHORE PAGE 369

AIR 1940 PRIVY COUNCIL PAGE 116

(مسجد شہید گنج وغیرہ بنام گوروددوارہ پربدھک کمیٹی امرت سر)

بابری مسجد تو بہر حال بابری مسجد تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ کسی مندر پر قبضہ کر کے مسلمانوں نے اسے مسجد کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہو جیسا کہ سکھوں نے مسجد شہید گنج کے معاملہ میں کیا تھا۔ لیکن اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ بابری مسجد کی عمارت اس سے پہلے مندر تھی تب بھی لاہور ہائی کورٹ اور پریوی کاؤنسل کے فیصلوں کی بنیاد پر مسلمان اپنا مقدمہ جیت جائیں گے۔

فسطائی طاقتوں کو بخوبی اندازہ تھا کہ وہ مقدمہ ہار جائیں گے۔ اس لئے ایک منصوبہ بند سازش کے تحت ۶، دسمبر ۱۹۹۲ء کو مسجد شہید کر دی گئی اور پھر صدارتی رائے طلبی کا ڈراما کیا گیا۔ لیکن صدارتی رائے طلبی ایک بہت بڑا فراڈ تھا صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے سپریم کورٹ آف انڈیا سے یہ رائے مانگی تھی کہ آیا " بابری مسجد تعمیر سے پہلے وہاں کوئی ہندو مندر یا کوئی اور ہندو مذہبی عمارت موجود تھی؟"

فسطائی طاقتوں نے جو تنازعہ اٹھایا تھا، اس کا موازنہ اس ریفرنیس سے کیجئے تو دونوں میں کوئی نسبت نظر نہیں آئے گی۔ وشو ہند

پریشد، وغیرہ کا یہ کہنا تھا کہ

(۱) جہاں بابری مسجد ہے وہاں شری رامچندر جی پیدا ہوئے تھے۔

(۲) وہاں ایک شری رام مندر تھا۔

(۳) اس مندر کو توڑ کر بابری مسجد بنائی گئی۔

اس طرح سے دیکھتے ہیں کہ تنازعہ کچھ اور کھڑا کیا گیا تھا اور ریفرینس کسی اور چیز کے بارے میں مانگا گیا۔ ایسا کیوں کیا گیا؟ یہ بھی ایک فراڈ ہے۔ یہاں بھی فسطائی طاقتوں نے دیکھا کہ بابری مسجد کی جگہ جنم استھان اور رام مندر ثابت کرنا ناممکن ہوگا اس لئے لفظ "ہندو مندر یا کوئی اور مذہبی عمارت" لکھ کر کے ریفرینس کے دائرے کو ہندوؤں کے حق میں وسیع کر دیا گیا۔ "کوئی اور ہندو مذہبی عمارت" کے الفاظ نے تو دائرے کو ہندوؤں کے حق میں انتہائی حد تک وسیع کر دیا۔ ایسا اس لئے کیا گیا کہ کچھ تاریخ دانوں کا ایسا خیال ہے کہ ایودھیا جب ساکیت تھا تو وہاں پر بدھ مذہب کے بہت سارے مندر تھے جنہیں برہمن راجاؤں نے توڑ دیا تھا اور جب بابری مسجد بنی تو بدھ بہار کے ملبے جو ادھر ادھر پڑے تھے، ان کا استعمال اس مسجد کی تعمیر میں کیا گیا۔ چونکہ بدھ مذہب کا شمار بھی ہندو مذہب میں ہوتا ہے۔ اس لئے اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ بابری مسجد میں بدھ بہار کے ملبے کا استعمال ہوا تھا، تو وہ ہندو مذہبی عمارت ثابت ہوتی۔ اس لئے کہ ریفرینس کے الفاظ سے وہاں صرف رام مندر کے موجود ہونے

کا ثابت ہونا ضروری نہیں تھا بلکہ کوئی بھی ہندو مندر یا کوئی اور ہندو مذہبی عمارت جس میں مٹھ اور سمادھی بھی شامل ہوتی اس ریفرنسن کے دائرے میں آجاتی۔

اس کے علاوہ ریفیرنس میں الفاظ آئے ہیں " بابری مسجد کی تعمیر سے پہلے "۔ کتنا پہلے اس کی کوئی نشاندہی ہی نہیں کی گئی یعنی جس ہندو مندر یا عمارت کی بات کہی جارہی ہے وہ بابری مسجد تعمیر ہونے کے سو سال یا پانچ ہزار سال پہلے کی بھی ہو سکتی ہے۔ ریفرینس میں یہ ہونا چاہیئے تھا کہ " بابری مسجد کی تعمیر ہونے کے عین قبل۔"

اس کے علاوہ آئین کے آرٹیکل ۱۴۳ (۱) کے تحت جو سپریم کورٹ سے رائے طلب کی جاتی ہے، اس پر عمل کرنا یا اسے عمل میں لانا حکومت پر لازم (Binding) نہیں ہے۔ اس لئے اگر سپریم کورٹ یہ رائے دی بھی دیتی کہ بابری مسجد کے تعمیر سے پہلے وہاں کوئی ہندو مندر یا ہندو مذہبی عمارت موجود نہیں تھی تو حکومت اس رائے پر عمل کرنے کی پابند نہ ہوتی بلکہ ایسا اقدام کرنے کے لئے آزاد ہوتی جس سے اسے ہندو طاقتوں کی خوشنودی حاصل ہوتی۔

اگر سپریم کورٹ کا جواب ریفرینس کے اثبات میں ہوتا، تب بھی اکثریت کی خوشنودی حاصل کرنے کا مضبوط بہانہ ہاتھ آجاتا اور بابری مسجد کی جگہ رام مندر بنانے کا کام آسان ہو جاتا۔ ایک تیسری صورت یہ

بھی تھی کہ اگر سپریم کورٹ کا جواب نفی میں ہوتا تو فسطائی طاقتیں اسے ماننے سے یہ کہ کر انکار کر دیتیں کہ اصل جھگڑا تو جائے پیدائش (گربھ گرہ) کا ہے اور چونکہ ریفرنس میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے اس لئے سپریم کورٹ کی رائے کے پابند نہیں اور نہ ہی یہ رائے اصل نزاع سے تعلق رکھتی ہے۔

ریفرینس کے آتے ہی مسلمانوں نے اس فراڈ کو بھانپ لیا تھا اس لئے ہر طرف سے اس کی پر زور مخالفت کی گئی۔ سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے بھی اس فراڈ کو بھانپ لیا تھا۔ اس لئے ریفرینس کی شنوائی کے دوران فاضل ججوں نے سولیسیٹر جنرل سے دریافت کیا کہ اگر سپریم کورٹ کی رائے ریفرینس کی نفی میں ہوتی ہے تو کیا حکومت دوبارہ مسجد تعمیر کرنے کی پابند ہوگی۔ حکومت ہند کی طرف سے جو تحریری جواب آیا وہ اطمینان بخش نہیں بلکہ گول مول تھا۔ اس لئے سپرم کورٹ نے یہ کہہ کر ریفرینس کا جواب دینے سے انکار کر دیا کہ (الف) یہ مبہم ہے (ب) اس کے جواب دینے سے کوئی آئینی مقصد حل نہیں ہوگا۔ (ج) ریفرنس اصل تنازعہ کا احاطہ نہیں کرتا اور (د) اکثریتی فرقہ کے حق میں جانبدارانہ ہے۔

ایک طرف تو ریفرنس کر دیا جس کی دونوں صورتوں میں مسلمان نقصان میں ہوتے اور دوسری طرف لکھنؤ عدالت میں زیر سماعت ملکیت کے سارے مقدموں کو سوخت (Abate) کر کے مسلمانوں کو ان کے حق دفاع (Right to defend) سے محروم کر دیا۔

اب مسلمانوں کے حق میں جتنی ناقابل تردید شہادتیں اور دستاویزی ثبوت تھے سب چشم زدن میں بے کار ہو گئے تھے۔

ایودھیا حصول آراضی ایکٹ ۱۹۹۳ء کے دفعہ ۴(۳) کے ذریعہ حکومت نے مسلمانوں کو حق دفاع اور عدالتی چارہ جوئی (جو ایک آئینی حق ہے) سے محروم کر دیا۔ اور کسی متبادل دادرسی یا عدالتی چارہ جوئی کا انتظام کئے بغیر ریفرینس کے مبہم الفاظ میں عدالت عالیہ کو الجھانے کی کوشش کی جسے سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے ریفرینس کو بصد احترام واپس کر کے ناکام کر دیا۔

باب سوم

## توہین عدالت (Comtempt of Court)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو ہی سپریم کورٹ نے ایک دوسرا تاریخ ساز فیصلہ بھی سنایا۔ یہ فیصلہ اس وقت کے چیف جسٹس آف انڈیا جناب ایم۔ این۔ وینکٹ چلیا اور جسٹس جی۔ این رے پر مشتمل بینچ نے صادر فرمایا۔ اس میں پوپی کے سابق وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ کو توہین عدالت کا مرتکب قرار دیتے ہوئے ایک دن کی سزا اور دو ہزار روپے کا جرمانہ عائد کیا۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جسٹس وینکٹ چلیا کا سپریم کورٹ میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۴ء آخری دن تھا۔ ۲۵ اکتوبر سے وہ ریٹائر ہونے والے تھے اور ۲۴ اکتوبر کو فیصلے صادر نہ ہوتے تو پھر بنچ میں کسی دوسرے جج کو رکھنا پڑتا اور نئے سرے سے بحث ہوتی پھر فیصلے آتے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لئے چیف جسٹس نے اس وقت کے اور بھی اہم مقدمات کو چھوڑ کر مقدمہ ہذا پر ساری توجہ اور وقت صرف کر دیا اور بالآخر ۲۴ اکتوبر کو ریفرینس پر اور توہین عدالت پر فیصلے سنا دئے گئے۔

# توہین عدالت کے بہت سارے مقدمات

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ توہین عدالت کے بہت سارے مقدمات سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہیں جن کی تفصیل بعد میں دی جائے گی۔ توہین عدالت کا اصل مقدمہ جس کا تعلق ٦ دسمبر ١٩٩٢ء کے گھناؤنے واقعات سے ہے، ابھی زیر سماعت ہے جس میں بھارتیہ جنتا پارٹی، بجرنگ دل، وشو ہندو پریشد، اور کانگریس کے چند اہم لیڈر بشمول وزیر اعظم جناب پی وی نرسمہاراؤ کو بھی فریق بنایا گیا ہے۔

# کلیان سنگھ کے ذریعہ توہین عدالت

## کس کی درخواست پر

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کلیان سنگھ سابق وزیر اعلیٰ یوپی (بی جے پی حکومت) کو جن مقدمات میں سزا ہوئی انہیں محمد اسلم عرف بھورے اور اچھن رضوی نے دائر کئے تھے۔

توہین عدالت مقدمہ نمبر ٧٩ بابت ١٩٩١ء جو رٹ پٹیشن (سول نمبر ٩٧٧ اور ٩٧٢ بابت ١٩٩١ء کے تحت تھا، اسے محمد اسلم عرف بھورے نے اپنے وکیل جناب ایم ایم کشیپ کے ذریعہ دائر کیا تھا۔ توہین عدالت

مقدمہ نمبر ۱۰۲ بابت ۱۹۹۲ء جو رٹ پٹیشن (سول) نمبر ۱۰۰۰ بابت ۱۹۹۱ء کے تحت تھا، اسے اچھن رضوی نے دائر کیا تھا۔

چونکہ ان دونوں توہین عدالت کے مقدمات کا تعلق سابق وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ سے تھا، اس لئے ان سارے مقدمات کا نبٹارا ایک مشترک فیصلہ سے کر دیا گیا۔

## وہ آرڈر جس کی حکم عدولی کلیان سنگھ نے کی تھی

یوں تو اخبارات، ٹی۔وی اور ریڈیو کی خبروں کے مطابق ساری دنیا جانتی ہے کہ کلیان سنگھ اور دوسرے فسطائی لیڈروں نے عدالت عالیہ کے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی لیکن عدالت محض اس طرح کی خبروں کی بنیاد پر کسی کو سزا نہیں دے سکتی۔ سزا کے لئے یہ ضروری ہے کہ عدالت نے کسی شخص کو کچھ کرنے سے روکا ہو اور اس شخص نے جان بوجھ کر اس کام کو کیا ہو۔

بی۔ جے۔پی کی اس وقت کی حکومت نے بابری مسجد کے اطراف کی ۷۷.۱۲ ایکڑ زمین حصول آراضی ایکٹ کے تحت نوٹیفکیشن بتاریخ ۷ اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء کے اکوائر کیا جس کی واجبیت اور آئینیت کو محمد اسلم عرف بھورے نے سپریم کورٹ میں رٹ نمبر ۷۲۹ اور ۷۷۹ بابت ۱۹۹۱ء کے ذریعہ چیلینج کیا جس میں سپریم کورٹ نے ۱۵ نومبر ۱۹۹۱ء کو حکم امتناعی پاس

کیا۔ سپریم کورٹ نے اس بات کا نوٹس لیا کہ ۲ نومبر ۱۹۹۱ء کو قومی یکجہتی کونسل (National Integration Council) کی میٹنگ میں کلیان سنگھ نے مندرجہ ذیل یقین دہانیاں دی تھیں۔

(الف) حتی الامکان کوشش کی جائے گی کہ تنازعہ کا کوئی پرامن تصفیہ نکل آئے (ب) جب تک مسئلہ کا کوئی حل نہیں نکل جاتا تب تک اتر پردیش حکومت کی پوری ذمہ داری ہوگی کہ بابری مسجد رام جنم بھومی عمارت کی حفاظت کرے۔

(ج) حصول آراضی کے سلسلے میں عدالت کے ذریعہ صادر کئے گئے سارے فیصلوں کی پاسداری کی جائے گی۔

(د) الہ آباد ہائی کورٹ کے ذریعہ صادر کئے گئے آرڈر کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔

کلیان سنگھ کے وکیل نے تسلیم کیا تھا کہ کونسل کے سامنے یقین دہانیوں کو کورٹ کے سامنے یقین دہانی مان لیا جائے۔ پھر سپریم کورٹ نے واضح الفاظ میں آرڈر لکھا کہ وہاں کوئی تعمیری کام نہیں ہوگا۔ اکوائر کی گئی آراضی پر روک لگادیا گیا۔

محمد اسلم کی طرف سے بحث کی گئی کہ رام مندر کے نظریہ کو رو بہ عمل لانے کے لئے اس وقت کے چیف منسٹر کلیان سنگھ کی حکومت نے دائمی تعمیر کے لئے لوگوں کو اکسایا اور کئی طرح سے ان کی مدد کی اور اس

طرح وہاں ایک پکا دائمی پلیٹ فارم بن گیا جو در حقیقت مجوزہ رام مندر کی بنیاد تھی۔

## وزیر اعلیٰ کا دفاع

وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ کی طرف سے توہین عدالت کے مقدمہ میں جو دفاع پیش کیا گیا وہ بہت ہی کمزور اور مضحکہ خیز تھا۔ دفاع میں کہا گیا کہ چترماس کا وقت ہونے کی وجہ سے وہاں بہت سارے سادھو جمع ہو گئے تھے جنہوں نے سیمینٹ کا ایک پکا پلیٹ فارم بنانا شروع کر دیا۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اگر کوئی سخت کاروائی کی جاتی تو اس کے رد عمل کے طور پر عمارت کو نقصان پہنچ سکتا تھا جس کو بچانا حکومت کی ذمہ داری تھی اس لئے حکومت نے کوئی سخت کارروائی نہیں کی۔

## سرکاری افسران کے بیانات

لیکن سرکای افسروں نے جو بیانات / رپورٹ / حلف نامے پیش کئے، اس سے مسٹر کلیان سنگھ کا دفاع بالکل جھوٹا ثابت ہوا۔ مسٹر پربھات کمار، پرنسیپل سکریٹری حکموت اتر پردیش نے اپنا حلف نامہ سپریم کورٹ میں داخل کیا جس کے ساتھ چیف انجینیر کا رپورٹ منسلک تھا چیف انجینیر کی رپورٹ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مندر بنانے کی غرض سے

تین تہوں پر مشتمل بہت ہی مضبوط بنیاد تعمیر کی گئی تھی۔ مسٹر پربھات کمار نے اپنے حلف نامے میں یہ بھی لکھا کہ جو لوگ تعیری کام کر رہے تھے ان کے مطابق سنگھ دوار کی تعمیر رام مندر کے سمت میں پہلا قدم ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرٹینڈینٹ آف پولیس نے چیف سیکریٹری کو بھیجے اپنی رپورٹ مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۹۲ء میں لکھا:

"۱۸ جولائی ۱۹۹۲ء کو صبح آٹھ بجکر ۴۵ منٹ اور ساڑھے نو بجے کے درمیان ہم لوگوں نے شری اشوک سنگھل اور شری انکار بھاوے سے ملاقات کر کے کہا کہ چونکہ ہائی کورٹ نے اپنے آرڈر مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۹۲ء کو نافذ کرنے کی ذمہ داری ہمیں سونپی ہے اس لئے ہم استدعا کرتے ہیں کہ تعمیر کا کام آپ روک دیں۔ ان لوگوں نے بتایا کہ ۱۷ جولائی ۱۹۹۲ء کی میٹنگ میں پچاس سادھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ تعمیر کا کام نہیں روکا جائے گا۔"

## رائے کمیٹی کی رپورٹ

سپریم کورٹ نے مسٹر ایس رائے، رجسٹرار اجنرل سپریم کورٹ پروفیسر کے کے نائر آئی۔ آئی۔ ٹی اور پروفیسر اروند کشن اسکول آف پلاننگ اینڈ آرکیٹیکچر نئی دہلی پر مشتمل ایک کمیٹی ایودھیا میں تعمیراتی کام کا جائزہ لینے کے لئے بحال کیا۔ کمیٹی نے اپنی تفصیلی رپورٹ میں کہا کہ تعمیر کی نوعیت ایسی ہے کہ اس پر ایک بڑا مندر کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ کمیٹی نے مزید لکھا کہ اتنا بڑا تعمیراتی کام بغیر واٹر ٹینکر (Water Tanker) سیمینٹ اور

پتھر ملانے والی مشین اور دوسرے تعمیراتی مشینری کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔

مندرجہ بالا رپورٹ کی بنیاد پر سپریم کورٹ اس نتیجے پر پہنچا کہ بہت بڑے پیمانے پر تعمیراتی کام (Constructional Work) ہوا ہے جس میں کئی ٹن سیمینٹ اور کنکریٹ کا استعمال ہوا۔ محمد اسلم عرف بھورے نے جو تصویریں عدالت میں پیش کیں ہیں ان سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس طرح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عدالت کی حکم امتاعی کے باوجود بڑے پیمانے پر تعمیراتی کام ہوا ہے۔ تعمیراتی اشیاء کو وہاں پہنچنے سے روکنے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سادھوؤں کو وہاں جمع ہونے پر روک لگانے سے رنجش بڑھ سکتی تھی لیکن یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ تعمیراتی اشیاء اور مشینیں وہاں کیوں جانے دی گئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ حکومت کی ایما اور ملی بھگت سے ہوا۔ چونکہ وزیر اعلیٰ قومی یکجہتی کونسل اور عدالت کو یہ یقین دہانی دے چکے تھے کہ عدالت کے حکم کی پاسداری کریں گے اس لئے اس تعمیراتی کام سے ان کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عدالت کے سامنے ایک اور قانونی سوال تھا۔ وہ یہ کہ وزیر اعلیٰ نے جو یقین دہانی (Undertaking) دی تھی وہ چیف منسٹر کی حیثیت سے دی تھی یا ذاتی طور پر۔ عدالت نے یہ رولنگ دی ہے کہ یقین دہانی

دونوں حیثیت میں دی تھی۔

## انگلینڈ اور امریکہ کی نظیریں

انگلینڈ اور امریکہ سپریم کورٹ کی نظیروں کا حوالہ دیتے ہو۔
سپرم کورٹ آف انڈیا نے اس تاریخی فیصلے میں لکھا ہے کہ چونکہ حکومت
قانون کی ہوتی ہے نہ کہ آدمیوں کی

Government of laws and not of men

اس لئے حکومت اور انتظامیہ کی یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ عدا
فیصلوں کا احترام کرے اور اس کی حکم عدولی نہ کرے۔ سپریم کورٹ
فاضل ججوں نے مزید لکھا ہے:

"ہماری قومی تعمیر کے ابتدائی دنوں میں اس حقیقت کو پہلے سے زیادہ شدت سے تسلیم کرنا ہے کہ ایک مختلف النوع سماج کو یکجا اور متحد رکھنے کے لئے قانون ہی واحد اور سب سے بڑا ذریعہ ہے قانون کی پاسداری اور قانونی اداروں کا احترام ہی ایک مختلف النوع ملک کو متحد رکھ سکتا ہے۔ نظریاتی یا جذباتی تنازعات کا حل قانونی بنیاد اور قانونی اداروں کی پرواہ کئے بغیر اگر طاقت کی بنیاد پر کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے ہماری منتخب شدہ سیاسی ڈھانچے کی بنیادی قدریں پامال ہو جائیں گی۔ اس سے تسلیم شدہ آئینی اداروں پر سے عوام کا اعتماد ٹوٹ جائے گا اور پرامن طریقہ سے تنازعات کو حل کرنے کا جذبہ کمزور پڑ جائے

گا۔ یہ قانون کی حکمرانی اور عدالت کی طاقت کو ختم کر دے گا اور افراد اور اکثریت کی طاقت کو قانون کی معقولیت پر غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ جس کے نتیجے میں بربادی، خون خرابہ، سماجی افراتفری پیدا ہو گی اور ہر وہ چیز جسے ہم مقدس سمجھتے ہیں، برباد ہو جائے گی۔ اس طرح کے گمراہ کن جذبے سے رواداری، جو کہ ہماری قومی زندگی کی سب سے بڑی قدر ہے، برباد ہو جائے گی۔"

## سزا

سپریم کورٹ نے مسٹر کلیان سنگھ کو توہین عدالت کا مرتکب قرار دیتے ہوئے ایک دن کی سزا اور دو ہزار روپے کا جرمانہ عائد کیا۔ وہ ایک دن کی سزا کاٹ چکے ہیں اور دو ہزار روپے عدالت میں جمع کرا چکے ہیں جس کے حقدار محمد اسلم ہیں۔ لیکن محمد اسلم نے یہ پیسہ نہیں لیا ہے، اس لئے کہ مسٹر کلیان سنگھ اور دوسرے لوگوں پر توہین عدالت کا اصل مقدمہ (۶ دسمبر کے مسماری کے سلسلے میں) زیر سماعت ہے۔

## تاریخی فیصلہ

یہ بات صحیح ہے کہ مسٹر کلیان سنگھ کے سنگینئ جرم کو دیکھتے ہوئے ایک دن کی قید اور دو ہزار روپئے کا جرمانہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ توہین عدالت کا مقدمہ بابری مسجد کے

قریب ایکوائر شدہ زمین پر پختہ پلیٹ فارم تعمیر کرنے کے سلسلے میں ہے۔ ۶
دسمبر کے سلسلے میں توہین عدالت کے مقدمہ کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔
یہ فیصلہ تاریخی اس اعتبار سے اس لئے اہم ہے کہ سپریم کورٹ نے ایک
قانونی اصول قائم کر دیا ہے کہ وزیر اعلیٰ یا وزیر اعظم یا کوئی بھی منسٹر یا
انتظامیہ کا کوئی بھی افسر توہین عدالت کا مرتکب ہو سکتا ہے چاہے وہ قائم
مقام ہو یا سابق۔ اس بنیاد پر وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا کہ اب وہ اس
منصب پر نہیں ہے جب عدالت کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی تھی۔ پھر
وہ دو حیثیتوں میں ذمہ دار ہے۔ اپنے منصبی حیثیت میں اور ذاتی حیثیت
میں بھی۔ دراصل سپریم کورٹ آف انڈیا نے پہلی بار سیاست دانوں کو اس
فیصلہ کے ذریعہ وارننگ دی ہے کہ آپ بھی قانون کی دسترس سے باہر
نہیں۔

باب چہارم

# زیر سماعت مقدمات اور ان کی نوعیت

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کی مسماری کے سلسلے میں توہین عدالت کا اصل مقدمہ ابھی سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اتوار کا دن تھا۔ ۲ بجے دن میں بی بی سی کے ذریعہ جناب محمد اسلم کو معلوم ہوا کہ بابری مسجد شہید کر دی گئی لیکن تفصیل نہ معلوم ہو سکی۔ انہوں نے فوراً ایک درخواست چیف جسٹس کے گھر پر دی اور چیف جسٹس کی رہائش گاہ پر چیف جسٹس اور جسٹس جی این رے پر مشتمل بینچ کی ایک خصوصی بیٹھک ہوئی۔ اٹارنی جنرل کی درخواست پر اس بیٹھک کو ساڑھے آٹھ بجے شام کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

ساڑھے آٹھ بجے خصوصی بیٹھک ہوئی سارے فریقین کے وکلاء موجود تھے۔ کلیان سنگھ اور حکومت اتر پردیش کے سینئر وکیل جناب کے کے وینو گوپال حاضر ہوئے اور کہا کہ "میں شرم سے اپنا سر جھکاتا ہوں"۔

"I hang my head in shame."

اس وقت تک کلیان سنگھ استعفیٰ دے چکے تھے اور صدارتی راج قائم ہو چکا تھا۔ فاضل ججوں نے افسوس کا آرڈر پاس کیا اور لکھا کہ

"نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اتنے بڑے اور حساس معاملہ میں ایک آئینی حکومت اپنے فرائض انجام نہ دے سکی۔"

IA NO. 14 IN C.P. NO. 91/1992

توہین عدالت کا یہ مقدمہ جناب محمد اسلم عرف بھورے نے ۸ افراد کے خلاف دائر کیا ہے جن کے نام ہیں (۱) مسٹر ایم ایم جوشی (۲) مسٹر ایل کے آڈوانی (۳) مسٹر اشوک سنگھل (۴) مسٹر ونے کٹیار (۵) اچاریہ گری راج کشور (۶) مسٹر موریشور ساوے (۷) سادھوی رتمبھرا اور (۸) مس اوما بھارتی۔ بتاریخ ۴ فروری ۱۹۹۴ء کو سپریم کورٹ نے ان سب کے نام نوٹس جاری کر دئے۔ نوٹس سب پر تعمیل ہو چکا ہے۔ پانچ افراد کی طرف سے جوابی حلف نامہ بھی داخل ہو چکے ہیں۔ جوابی حلف نامے سب کے سب ایک جیسے ہیں۔ اپنے دفاع میں جو دلیلیں پیش کی گئیں ہیں وہ نہایت کمزور، ناقابل اعتبار اور پھسپھسی ہیں۔

IA NO. 7 IN C.P. NO. 97/1992

سپریم کورٹ نے مسٹر کلیان سنگھ اور چھ افسروں کے نام نوٹس خود سے ((Suo Motu) جاری کئے ہیں۔ ان چھ افسروں کے نام ہیں (۱) مسٹر یو سی تیواری ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (۲) مسٹر آر این شریواستو، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، فیض آباد (۳) مسٹر پربھات کمار، پرنسپل سیکریٹری، حکومت اتر پردیش (۴) مسٹر یوگیش نندن، جوائنٹ سیکریٹری

حکومت اتر پردیش (۵) مسٹر آلوک سہنا، ٹورزم سیکریٹری حکومت اتر پردیش (۶) مسٹر شیکھر اگروال، اسپیشل سیکریٹری حکومت اتر پردیش۔

ان سب پر چھ دسمبر کی مسماری کے سلسلے میں وجہ بتاؤ نوٹس جاری ہوئے ہیں کہ کیوں نہیں ان کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ چلایا جائے۔

اسی آئی اے میں عدالت سے یہ بھی استدعا کی گئی ہے کہ بابری مسجد کی اسی جگہ تعمیر کے لئے حکم صادر فرمایا جائے۔

C.P. NO. 218/1993

توہین عدالت کے اس مقدمے میں محمد اسلم عرف بھورے صاحب نے (۱) وزیر اعظم جناب پی وی نرسمہاراؤ (۲) ہوم منسٹر ایس بی چوہان (۳) ایم ایم جیکب (۴) مسٹر رام لال راہی (۵) مسٹر راجیش پائلیٹ (۶) مسٹر پی ایم سعید (۷) چیف سیکریٹری ٹی ایس آر سبرامنیم اور (۸) جناب ارجن سنگھ کو فریق بنایا ہے۔ ان لوگوں پر یہ الزام ہے کہ مسماری ان کی ملی بھگت سے ہوئی۔ یہ لوگ جان بوجھ کر اپنے فرائض منصبی سے غافل رہے۔ صدارتی راج قائم ہو جانے کے بعد ریاست کا نظم و نسق مرکزی حکومت کے ہاتھ میں آگیا اور عارضی مندر بنانے کی مہلت جان بوجھ کر دی گئی وغیرہ

توہین عدالت کے سارے مقدمات کو یکجا کر دیا گیا ہے اور محمد اسلم والے مقدمہ کو لیڈنگ مقدمہ قرار دیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر

ہے کہ ریفرینس کے ساتھ محمد اسلم کے اس رٹ پٹیشن کا بھی فیصلہ ہوا جس میں انہوں نے اجودھیا حصول آراضی ایکٹ کی آئینیت کو چیلیج کیا تھا دراصل یہ محمد اسلم کے رٹ کا ہی نتیجہ تھا کہ سپریم کورٹ نے ایکٹ کے اس دفعہ کو غیر آئینی قرار دے دیا جس کی رو سے بابری مسجد کے متعلق ملکیت کے سارے مقدمات کو سوخت (Abate) کر دیا گیا تھا وہ از سر نو زندہ ہو گئے۔

## سپریم کورٹ کے لئے چیلنج

توہین عدالت کے مقدمات سپریم کورٹ کے لئے ایک زبردست چیلینج ہیں۔ دراصل انہیں مقدمات کے فیصلوں پر فسطائی طاقتوں کے مستقبل کے لائحہ عمل کا دارو مدار ہے۔ خود سپریم کورٹ نے لکھا ہے کہ بابری مسجد پر حملہ صرف مسجد پر حملہ نہیں تھا بلکہ قانون کی بالا دستی اور آئین پر حملہ تھا۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد پورے ہندوستان میں فساد پھوٹ پڑا۔ پر امن احتجاج کرتے مسلمانوں پر گولیاں چلائی گئیں انہیں ٹاڈا میں بند کر دیا گیا۔ کروڑوں روپئے کے املاک کا نقصان ہوا۔ بیرون ملک ہندوستان کی جگ ہنسائی ہوئی۔ جن لوگوں نے مسجد کو شہید کیا ان کا جرم قابل معافی نہیں۔ اگر ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ ہوا تو مستقبل میں قانون کی بالادستی اور آئین ہند کا خدا حافظ۔ قانون کی

معقولیت پر تعداد اور اکثریت کا غلبہ ہو گا۔ سپریم کورٹ نے ریفرینس کے فیصلے میں لکھا ہے

"ایودھیا کا سانحہ ایک طوفان ہے جو گذر جائے گا۔ لیکن اس کی وجہ سے سپریم کورٹ کے وقار اور عزت میں کمی نہیں آنے دی جائے گی۔

ایسا طوفان پھر نہ آئے اسکے لئے ضروری ہے کہ بابری مسجد کے مجرموں کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔ جن لوگوں نے اصل ڈھانے کا کام کیا ان سے بھی بڑے مجرم اور قصوروار وہ لیڈر ہیں جنہوں نے مسماری کے لئے انہیں اکسایا اور اپنی جذباتی تقریروں سے انہیں پاگل کر دیا۔ ان سارے لیڈران پر توہین عدالت کا مقدمہ زیر سماعت ہے۔

## پاکستانی اور نیپالی سپریم کورٹ

پاکستانی سپریم کورٹ نے نواز شریف حکومت کے صدر اسحاق خان کے ذریعہ برخاست کئے جانے کے فیصلے کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے انہیں بحال کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس پر عمل ہوا اور نواز شریف کی حکومت پھر بحال ہو گئی۔ اسی رطرح کی جرات کا مظاہرہ نیپالی سپریم

کورٹ نے کیا۔ وقت آگیا ہے کہ ہندوستانی سپریم کورٹ بھی بابری مسجد کے مجرموں کو ایسی سبق آموز اور سخت سزا دے کہ مستقبل میں کوئی بھی سیاسی لیڈر عدالت کی حکم عدولی اور توہین کرنے کی ہمت نہ کر سکے اور سیاسی فائدے کے لئے عبادت گاہ کی طرف نظر اٹھانے کی جرات نہ کر سکے

## بنارس کی گیان واپی مسجد اور متھرا کی عید گاہ

۱۹۹۲ء سے ہی بنارس کی گیان واپی مسجد اور متھرا کی عید گاہ پر خطرات کے بادل منڈلا رہے تھے۔ فسطائی طاقتیں اعلانیہ کہہ رہی تھیں کہ بنارس کی مسجد اور متھرا کی عید گاہ بھی ان کے نشانہ پر ہے۔ مرد مجاہد محمد اسلم عرف بھورے نے، جن کی ایک معمولی سی دوکان ہے، اس کے سلسلہ میں تین رٹ پٹیشن دائر کئے جن میں سپریم کورٹ نے مسجد اور عید گاہ کی حفاظت کے لئے بہت موزوں اور مناسب حکم صادر فرمایا۔ رٹ پٹیشن نمبر ۶۱۱ بابت ۱۹۹۲ء میں سپریم کورٹ نے مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو ایک آرڈر پاس کیا جس میں مرکزی حکومت اور یوپی کی صوبائی حکومت کو عبادتگاہ تحفظ ایکٹ کے تحت مسجد اور عید گاہ کی حفاظت کے لئے ہدایت دی۔ رٹ پٹیشن نمبر ۱۴۸ بابت ۱۹۹۵ء میں سپریم کورٹ نے ایک آرڈر پاس کیا جس میں آرڈر بتاریخ ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء کی توثیق کی۔ رٹ پٹیشن نمبر ۱۴۸

بابت ۱۹۹۵ء فروری ۱۹۹۵ء میں دائر کیا گیا۔ جب شوراتری اور عید گاہ کے تیوہار میں صرف چھ دنوں کا فرق تھا۔ رٹ پٹیشن نمبر ۵۴۱ بابت ۱۹۹۵ء اس وقت دائر کیا گیا جب وی ایچ پی اور بی جے پی وغیرہ کے کارسیوکوں نے ۱۷ اگست ۱۹۹۵ء کو متھرا میں کرشن جنم ستھان کے قریب مہایاجنا کا اعلان کیا سپریم کورٹ نے ۱۷ اگست ۱۹۹۵ء کو یک طرفہ حکم نامہ جاری کیا جس میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو بنارس کی مسجد اور متھرا کی عید گاہ کے تحفظ کے لئے ہدایت کی اور محمد اسلم عرف بھورے، مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کو کہا کہ وہ جب بھی مسجد یا عید گاہ کے سلسلے میں خطرہ محسوس کریں سپریم کورٹ سے رجوع کر سکتے ہیں۔

بنارس کی مسجد اور متھرا کی عید گاہ کے سلسلے میں سپرم کورٹ نے جتنے آرڈر پاس کئے ہیں ان کی پاسداری اور احترام اس بات پر منحصر کرے گا کہ بابری مسجد کے سیاسی مجرموں کے تئیں سپریم کورٹ توہین عدالت کے مقدمات میں کیسا رویہ اختیار کرتا ہے۔

## سپریم کورٹ کی اپنی نظیر

جے باسو دیون (آئی۔ اے۔ ایس) کو توہین عدالت کا مجرم قرار دیتے ہوئے سپریم کورٹ نے لکھا ہے۔

"قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ عدالت کی حکم

عدولی کرنے والوں کو سخت سزادی جائے۔اگر ایسا نہیں کیا گیا تو عوام پر اس کا برا اثر پڑے گا۔اگر عدالت کے حکم کا مذاق اڑایا جائے اور اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو عوام کا اعتماد عدلیہ پر سے اٹھ جائے گا۔اور لوگ اپنے تنازعات کے فیصلے کے لئے وقت، پیسے اور توانائی صرف کرنے سے گریز کریں گے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ انصاف کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے سڑکوں پر پیسے اور طاقت کی بنیاد پر فیصلے کریں گے۔طاقتور کی جیت ہوگی اور غریب اور کمزور کی ہار۔ قانون کی حکمرانی اور سماجی انصاف کے لئے یہ سم قاتل ثابت ہوگا۔"

عدالت کے احترام کو نافذ کرنے کے لئے سپریم کورٹ نے مسٹر کلیان سنگھ اور مسٹر جے واسو دیون کے توہین عدالت کے مقدمات میں بہت ہی سخت اور سنہرے قانونی اصول مرتب کئے ہیں۔ اقوام عالم کی نگاہیں عام طور پر اور ہندوستان میں کروڑوں انصاف پسند افراد کی نگاہیں خاص طور پر سپرم کورٹ پر لگی ہوئی ہیں کہ سپریم کورٹ بے یار و مددگار بابری مسجد کو مسمار کرنے اور کرانے والے سیاسی مجرموں کو کیا سزا دیتی ہے۔

ختم شد

نوٹ۔زیر سماعت مقدمات کے فیصلے کے بعد مصنف کی دوسری کتاب شائع ہوگی جس میں فیصلے پر مکمل روشنی ڈالی جائے گی۔

# BABRI MASJID, SECULARISM AUR SUPREME COURT

## مشتاق احمد (علیگ) ایڈووکیٹ.....ایک تعارف

ایودھیا (فیض آباد) میں واقع ایک قدیم عبادت گاہ بابری مسجد کا سانحہ ارتحال جہاں دنیا کی ساری بین الاقوامی برادری کے لئے ایک لمحۂ فکریہ بن کر سامنے آیا وہیں ہندوستان میں کروڑوں دردمند ، مظلوم اور دبے کچلے لیکن جمہوری اقدار میں پختہ یقین رکھنے والے ہندو ۔ مسلم عوام نے اس سانحہ عظیم کو ایک چیلینج کے طور پر قبول کیا اور ان فاشسٹ طاقتوں کے خلاف یہ لڑائی ہنوز جاری ہے جس کی ایک مثال زیر نظر کتاب کے مصنف ہیں۔

جناب مشتاق احمد صاحب ایڈووکیٹ صوبہ بہار کے ضلع گوپال گنج کے ایک چھوٹے سے گاؤں نوادہ میں یکم جولائی ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئے ۔ ۱۹۷۰ء میں بہار بورڈ سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور حکومت بہار سے نیشنل میرٹ اسکالر شپ حاصل کی اس کے بعد آپنے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی (A.M.U) میں داخلہ لیا جہاں سے بی ۔ اے اور ایل ۔ ایل ۔ بی کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کئے ۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ء میں آپ نے گوپال گنج سول کورٹ میں وکالت شروع کی اور ضلع عدالت میں ایک محنتی اور کامیاب وکیل کی حیثیت سے متعارف ہوئے ۔ ۱۹۸۵ء میں، تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی، کے تحت آپ نے گوپال گنج کو خیرباد کہہ کر ملک کی عدالت عظمیٰ (سپریم کورٹ) میں آکر پریکٹس شروع کی جہاں ملک کی مشہور و معروف کمپنیوں اور اداروں کے قانونی مشیر ہونے کے ساتھ ساتھ آپ نے مشہور اور تاریخی نوعیت کے حامل مقدمات میں کامیاب پیروی کی ۔ دہلی کے ادبی اور سماجی حلقوں میں آپ کا ایک خاص مقام ہے ۔ ملک کے مشاہیر اخبارات اور رسائل میں قانونی موضوعات پر آپ کے مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ بابری مسجد سے متعلق سپریم کورٹ مقدمات میں آپ نے رحیل کارواں کا کام انجام دیا اور قانون کی حکمرانی اور عدل و انصاف پر مبنی معاشرے کی لڑائی میں آپ پہلی قطار میں رہے ۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ....

ہارون رشید بہاری ایڈیٹر ہویدی (ہفتہ وار)
G-53/4 بٹلہ ہاؤس، اوکھلا نئی دہلی۔